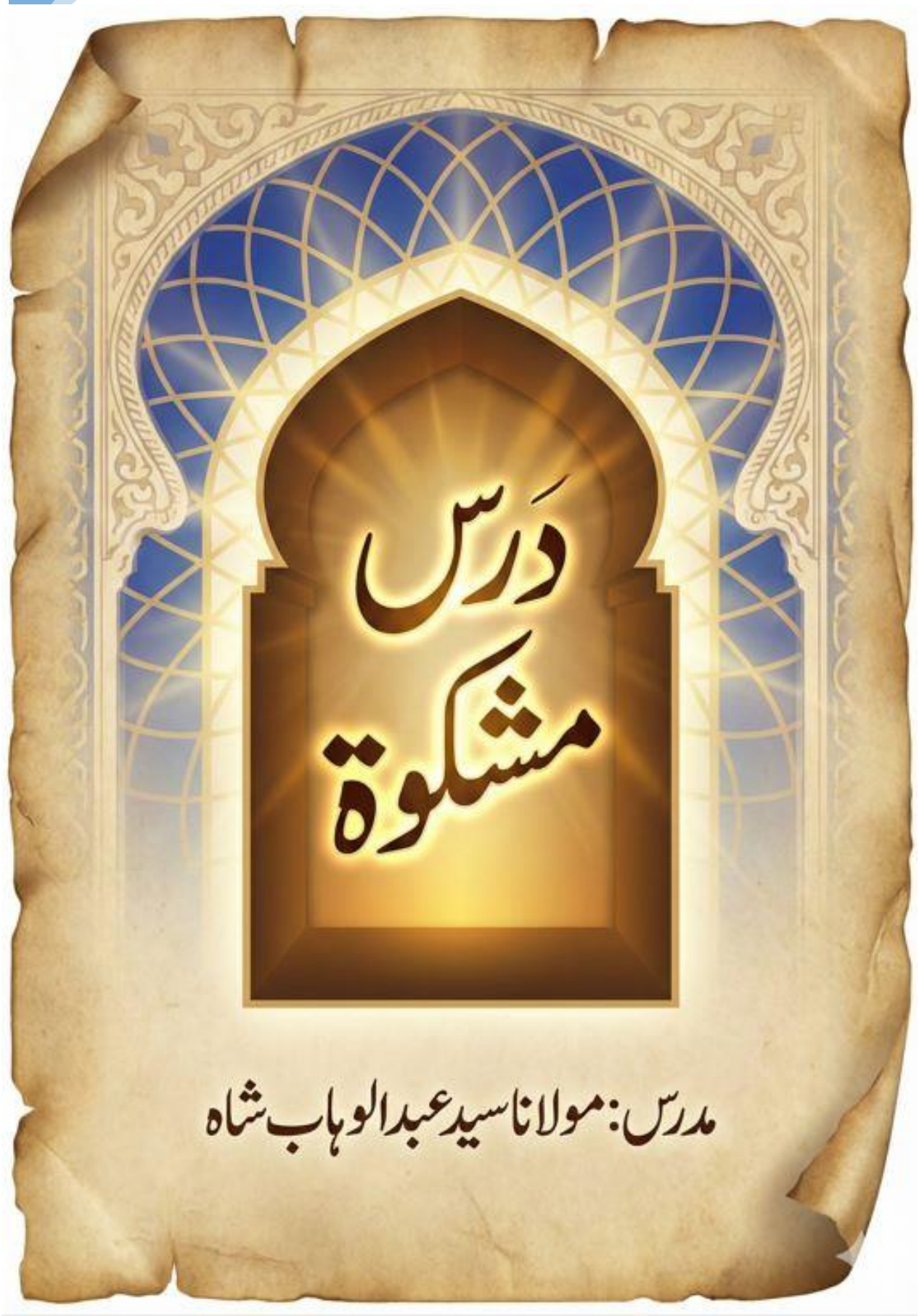
دَرس
مشکوۃ
مدرس: مولانا سید عبدالوہاب شاہ

مشکوۃ المصابیح اور مصنف کا تعارف

اس کتاب کا پورا نام "مشکوۃ المصابیح" ہے۔

مشکوۃ: عربی میں اس "طاق" (Niche) کو کہتے ہیں جو دیوار میں چراغ رکھنے کے لیے بنایا جاتا ہے (جس کے آر پار سوراخ نہیں ہوتا)۔ اس طاق میں چراغ کی روشنی اکٹھی ہو کر زیادہ تیز اور روشن ہو جاتی ہے۔

مصابیح: یہ "مصباح" کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے "چراغ"۔

چونکہ یہ کتاب احادیثِ رسول ﷺ (جو ہدایت کے چراغ ہیں) کو ایک خاص ترتیب (طاق) میں جمع کرتی ہے تاکہ ان کی روشنی سے ہر مسلمان مستفید ہو سکے، اس لیے اسے "مشکوۃ المصابیح" (چراغوں کا طاق) کہا گیا۔

کتاب کی تاریخ اور پس منظر

دراصل ایک بزرگ امام بغوی رحمہ اللہ (وفات: 516ھ) نے احادیث کی ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "مصابیح السنہ" تھا۔ وہ کتاب بہت اچھی تھی لیکن اس میں دو کمیاں تھیں:

اس میں صحابی (راوی) کا نام مذکور نہیں تھا۔ دوسری یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ حدیث کس کتاب (بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ) سے لی گئی ہے۔

امام تبریزی کا کارنامہ: تقریباً دو سو سال بعد امام ولی الدین تبریزی رحمہ اللہ نے اس کتاب کو دوبارہ ترتیب دیا۔ انہوں نے نہ صرف ہر حدیث کے راوی کا نام لکھا بلکہ یہ بھی بتایا کہ یہ حدیث کس کتاب کی ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے بھی ایک ضمیمہ شامل کیا اور کتاب کا نام "مشکوۃ المصابیح" رکھا۔ آج دنیا بھر کے مدارس میں یہی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔

کتاب کی خاص ترتیب

امام تبریزی نے ہر باب کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے، جو اس کتاب کا سب سے بڑا حسن ہے:

پہلی فصل: اس میں صرف وہ احادیث ہیں جو بخاری اور مسلم (یا دونوں میں سے کسی ایک) میں ہیں۔ (یعنی اعلیٰ ترین صحت)۔

دوسری فصل: اس میں وہ احادیث ہیں جو بقیہ کتب (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ) سے لی گئی ہیں۔

تیسری فصل: اس میں وہ احادیث ہیں جو مفہوم کو واضح کرنے کے لیے لائی گئی ہیں، ان میں بعض ضعیف بھی ہو سکتی ہیں۔

مصنف کا تعارف (صاحبِ مشکوۃ)

نام: محمد بن عبداللہ۔ لقب: ولی الدین۔ کنیت: ابو عبداللہ۔

نسبت: الخطیب التبریزی (آپ تبریز کے رہنے والے تھے اور بہت اچھے خطیب تھے)۔

وفات: آپ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے، لیکن مشہور قول کے مطابق 741 ہجری کے لگ بھگ آپ کا انتقال ہوا۔

شخصیت: آپ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم، محدث اور عابد و زاہد انسان تھے۔ آپ کی زندگی کا زیادہ تر حصہ علمِ حدیث کی خدمت اور تدریس میں گزرا۔ آپ کے استاد امام طیبی رحمہ اللہ تھے (جنہوں نے مشکوۃ کی پہلی شرح "الکاشف" لکھی)۔ امام تبریزی کی عاجزی اور اخلاص کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی اس عظیم کتاب کے مقدمے میں کہیں بھی اپنا نام ظاہر نہیں کیا، اللہ نے ان کے خلوص کی بدولت اس کتاب کو ایسی قبولیت بخشی کہ آج 700 سال گزرنے کے باوجود گھر گھر اور مسجد مسجد اس کا درس دیا جاتا ہے۔

یہ کوئی معمولی کتاب نہیں بلکہ 700 سال پرانی وہ عظیم کتاب ہے جس میں 5900 سے زائد احادیث کا نچوڑ موجود ہے۔ اسے پڑھنے والا گویا حدیث کی تمام بڑی کتابوں (صحاح ستہ) کی سیر کر لیتا ہے۔"

درس نمبر:01۔حدیث نمبر:01

موضوع:نیت کی اہمیت اور اس کا اثر

عربی عبارت:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ، فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ». (متفق علیہ)

اردو ترجمہ:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے، اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہو، اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف (معتبر) ہے، اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے ہو یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہو، تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔"

تشریح:

اس حدیث کو امام بخاریؒ اور صاحبِ مشکوۃ نے سب سے پہلے اس لیے ذکر کیا ہے تاکہ طالبِ علم اور قاری سب سے پہلے اپنی نیت درست کر لیں۔

نیت کا مقام: نیت دل کے ارادے کو کہتے ہیں۔ فقہ حنفی کے مطابق بعض عبادات میں نیت شرط ہے (جیسے نماز، روزہ) اور بعض میں نیت ثواب کے لیے ضروری ہے اگرچہ وہ عمل نیت کے بغیر بھی صحیح ہو جاتا ہے (جیسے وضو میں نیت سنت ہے، جبکہ امام شافعیؒ کے ہاں فرض ہے)۔

اخلاصِ نیت: اس حدیث کا جوہر "اخلاص" ہے۔ اگر عمل بہت بڑا ہو لیکن نیت میں دکھاوا یا دنیاداری ہو، تو اللہ کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے برعکس عمل چھوٹا ہو مگر نیت خالص ہو، تو وہ پہاڑ جتنا ثواب بن جاتا ہے۔

مقصودِ ہجرت: حضور ﷺ نے ہجرت کی مثال دے کر سمجھایا کہ بظاہر ایک ہی جیسا سفر کرنے والے دو افراد کے اجر میں زمین آسمان کا فرق ہو سکتا ہے، صرف نیت کی وجہ سے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ انسان کے تمام اعمال کی قبولیت، اجر و ثواب اور ان کے حتمی نتائج کا دار و مدار صرف اور صرف نیت کے اخلاص پر ہے۔ یہ ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ نیت وہ بنیادی شرط ہے جو کسی بھی عمل کو اللہ کے ہاں مقبول عبادت یا محض ایک بے جان دنیاوی رسم بنا دیتی ہے؛ اگر ایک عظیم ترین عمل بھی خالصتاً اللہ کی رضا کے بجائے شہرت، دکھاوے یا کسی مادی فائدے کے لیے کیا جائے تو وہ بارگاہِ الٰہی میں رائیگاں ہے۔ یہ حدیث ہمیں اپنی زندگی کے ہر شعبے اور ہر چھوٹے بڑے کام میں اپنی نیتوں کی مسلسل نگرانی کرنے کی ترغیب دیتی ہے، کیونکہ بندے کو آخرت میں وہی اجر ملے گا جس کا اس نے اپنے دل میں پختہ ارادہ کیا تھا۔ یہ پیرا گراف ہمیں یہ بصیرت عطا کرتا ہے کہ ہم اپنی باطنی حالت کی اصلاح کریں اور اپنے ہر قدم کو بندگی کی روح سے منور کریں تاکہ ہم اللہ کے فضلِ خاص کے مستحق بن سکیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

آج کے دور میں اس حدیث کو ہم اپنی زندگی پر اس طرح نافذ کر سکتے ہیں:

سوشل میڈیا اور نیکی: آج ہم نیکی کرتے وقت (مثلاً کسی غریب کی مدد یا عمرہ) فوراً اس کی تصویر سوشل میڈیا پر ڈال دیتے ہیں۔ یہاں ہمیں رک کر سوچنا چاہیے کہ کیا میری نیت اللہ کو راضی کرنا ہے یا "لائکس" اور "تعریف" سمیٹنا؟ اگر نیت نمائش ہے تو وہ عمل ضائع ہو گیا۔

حلال رزق اور ملازمت: ایک شخص نوکری صرف اس لیے کرتا ہے کہ پیسہ آئے، جبکہ دوسرا یہ نیت کرتا ہے کہ میں حلال کما کر اپنے بچوں کی پرورش کروں گا اور رزقِ حلال کی برکت سے اللہ کی عبادت کروں گا، تو دوسرے شخص کی پوری ڈیوٹی "عبادت" میں شمار ہو گی۔

دینی کاموں میں نیت: آپ (مقتدیوں کو مخاطب کریں) جو فجر کے بعد یہاں بیٹھے ہیں، اگر نیت یہ ہے کہ اللہ کی بات سیکھیں گے، تو جب تک آپ یہاں بیٹھے ہیں، آپ کا وقت نفل عبادت میں لکھا جا رہا ہے۔

درس کا خلاصہ:

اللہ تعالیٰ عمل کی شکل نہیں، دل کی تڑپ اور نیت دیکھتا ہے۔

اپنے ہر کام (کھانے، پینے، سونے اور کمانے) سے پہلے ایک سیکنڈ کے لیے دل میں اللہ کی رضا کی نیت کر لیا کریں، وہ کام عبادت بن جائے گا۔

کتاب الایمان

درس نمبر:02۔حدیث نمبر:2

موضوع:دین کے تین بنیادی درجات(اسلام،ایمان اور احسان)

کتاب:مشکوۃ المصابیح(کتاب الایمان)

عربی عبارت:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ، إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ، شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعَرِ، لَا يُرَى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخِذَيْهِ، وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا». قَالَ: صَدَقْتَ. قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ؟ قَالَ: «أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ». قَالَ: صَدَقْتَ. قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ؟ قَالَ: «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ».

(رواہ مسلم)

اردو ترجمہ:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک ایک شخص ہمارے سامنے نمودار ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال خوب سیاہ تھے۔اس پر سفر کے کوئی آثار بھی نہ تھے(یعنی وہ مسافر نہیں لگتا تھا)اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہ تھا(یعنی وہ مقیم بھی نہیں تھا)۔وہ نبی کریم ﷺ کے قریب بیٹھ گیا،اپنے گھٹنے آپ ﷺ کے مبارک گھٹنوں سے ٹکا دیے اور اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لیے اور عرض کیا:اے محمد(ﷺ)!مجھے بتائیے کہ "اسلام" کیا ہے؟آپ ﷺ نے فرمایا:"اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں،نماز قائم کرو،زکوۃ ادا کرو،رمضان کے روزے رکھو اور استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔"اس نے کہا:آپ نے سچ فرمایا۔پھر اس نے پوچھا:مجھے بتائیے "ایمان" کیا ہے؟آپ ﷺ نے فرمایا:"ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر،اس کے فرشتوں پر،اس کی کتابوں پر،اس کے رسولوں پر،قیامت کے دن پر اور اچھی و بری تقدیر پر یقین رکھو۔"اس نے کہا:آپ نے سچ فرمایا۔پھر اس نے پوچھا:مجھے بتائیے "احسان" کیا ہے؟آپ ﷺ نے فرمایا:"احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو،اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے(یہ کیفیت پیدا نہ ہو)تو کم از کم یہ یقین ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

تشریح:

اس مشہورِ زمانہ حدیث کو "حدیثِ جبرائیل" کہا جاتا ہے۔اس میں دین کی پوری عمارت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے:

طلبِ علم کے آداب: حضرت جبرائیل علیہ السلام نے انسانی شکل میں آکر ہمیں سب سے پہلے یہ سکھایا کہ جب اللہ کے دین کی بات ہو رہی ہو تو کیسے بیٹھنا چاہیے۔ان کا ادب سے بیٹھنا اور سوال کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ علمِ دین بغیر ادب کے حاصل نہیں ہوتا۔

اسلام(ظاہری اعمال): یہاں پانچ ارکان کا ذکر ہے۔فقہِ حنفی کی روشنی میں یہ پانچوں اعمال فرضِ عین ہیں۔اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے،اور اگر سستی کی بنا پر چھوڑے تو سخت گناہگار ہے۔

ایمان(باطنی عقائد): ایمان کا تعلق دل کی تصدیق سے ہے۔اس میں "تقدیر" پر ایمان لانا بہت اہم ہے۔ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے علم اور اس کے فیصلے سے ہوتا ہے،خواہ وہ ہمیں اچھا لگے یا برا۔

احسان(روحانیت/تصوف): یہ دین کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ علمائے نے ہمیشہ اسی "احسان" کی اہمیت پر زور دیا ہے جسے "سلوک واحسان" یا تصوف بھی کہا جاتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی عبادت صرف رسمی نہ ہو، بلکہ اس میں اللہ کا استحضار (ہر وقت اللہ کے سامنے ہونے کا احساس) پیدا ہو جائے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ دین صرف خشک نظریات یا چند ظاہری اعمال کا نام نہیں بلکہ یہ عقائد (ایمان)، جسمانی اطاعت (اسلام) اور قلبی کیفیت (احسان) کا ایک مکمل نظام ہے۔ جب بندہ اللہ کی بندگی اس طرح کرتا ہے کہ گویا وہ اپنے رب کو دیکھ رہا ہے، تو اس کے ہر عمل میں وہ حسن اور اخلاص پیدا ہو جاتا ہے جو دین کی اصل روح ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

عبادت میں خشوع کی کمی: آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نماز تو پڑھتے ہیں مگر ہمارا دل کہیں اور ہوتا ہے۔ "احسان" کی یہ تعریف ہمیں حل بتاتی ہے: نماز شروع کرنے سے پہلے یہ سوچیں کہ "میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے"۔ جب یہ احساس پکا ہو جائے گا تو نماز میں ادھر ادھر کے خیالات آنا بند ہو جائیں گے۔

تعلیمی مجالس کا ادب: آج کل ہم موبائل فون ہاتھ میں لیے یا بے پروائی سے بیٹھ کر دینی بیانات سنتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا عمل بتاتا ہے کہ دینی محفل کا خاص ادب ہے، جتنا زیادہ ادب ہو گا اتنا زیادہ نورِ علم سینے میں اترے گا۔

تقدیر پر شکوہ: آج کل چھوٹی سی پریشانی آنے پر لوگ اللہ سے شکوہ کرنے لگتے ہیں کہ "میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟"۔ اس حدیث کا سبق یہ ہے کہ "بری تقدیر" پر بھی ویسا ہی ایمان ہونا چاہیے جیسا "اچھی تقدیر" پر ہے۔ اللہ کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے، چاہے ہماری عقل اسے ابھی نہ سمجھ سکے۔

خلاصہ درس:

کامل دین وہ ہے جس میں کلمہ و نماز (اسلام)، صحیح عقیدہ (ایمان) اور اخلاص و استحضار (احسان) تینوں موجود ہوں۔

محض کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں، بلکہ اللہ کی بندگی میں اس درجے تک پہنچنا اصل مقصود ہے کہ ہر پل اس کی نگرانی کا احساس رہے۔

درس نمبر: 03۔ حدیث نمبر: 4

موضوع: اسلام کی بنیاد اور اس کے پانچ بنیادی ستون

عربی عبارت:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ». (متفق عليه)

اردو ترجمہ:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔"

تشریح:

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اسلام کو ایک ایسی "عمارت" سے تشبیہ دی ہے جو پانچ ستونوں پر کھڑی ہے۔ کسی بھی عمارت کی مضبوطی اس کے ستونوں پر منحصر ہوتی ہے، اگر ستون کمزور ہوں یا گرا دیے جائیں تو عمارت گر جاتی ہے۔

شہادت (کلمہ طیبہ): یہ اس عمارت کی بنیاد (Foundation) ہے۔ جب تک کوئی شخص دل و جان سے اللہ کی وحدانیت اور حضور ﷺ کی رسالت کی گواہی نہیں دیتا، وہ اسلام کی عمارت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔

نماز: کلمے کے بعد سب سے اہم ستون نماز ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ "جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا"۔ یہ روزانہ کی حاضری ہے جو بندے کا تعلق اپنے خالق سے جوڑے رکھتی ہے۔

زکوٰۃ: یہ اسلام کا مالی نظام ہے۔ اس کا مقصد صرف غریب کی مدد نہیں بلکہ صاحبِ مال کے دل سے مال کی محبت نکال کر اللہ کی محبت پیدا کرنا اور مال کو پاک کرنا ہے۔

روزہ: یہ نفس کی تربیت کا ذریعہ ہے۔ انسان اللہ کے حکم پر حلال چیزیں (کھانا پینا) چھوڑ کر یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی زندگی کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے، اپنی خواہشات کے ہاتھ میں نہیں۔

حج: یہ عشقِ الٰہی کا مظہر اور امتِ مسلمہ کی وحدت کی علامت ہے۔ صاحبِ استطاعت پر زندگی میں ایک بار فرض ہے تاکہ وہ اپنے مرکز (بیت اللہ) سے وابستہ رہے۔

یہ پانچوں ارکان مل کر ایک مسلمان کی زندگی کو مکمل کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے، اور جان بوجھ کر سستی کرنا اسلام کی عمارت کو منہدم کرنے کے مترادف ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اسلام کی پوری عمارت ان پانچ بنیادی ستونوں پر کھڑی ہے جن کے بغیر ایک مسلمان کی مذہبی شناخت برقرار نہیں رہ سکتی۔ توحید و رسالت کے اقرار کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی پابندی کرنا ہی وہ بنیادی بندگی ہے جو انسان کو اللہ کا فرمانبردار بندہ بناتی ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

دین میں "سلیکشن" کا مزاج: آج ہم نے اپنی سہولت کے مطابق دین کے ارکان منتخب کر لیے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ "میرا دل صاف ہے، نماز کی کیا ضرورت؟" کوئی روزہ تو رکھتا ہے مگر زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل کرتا ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلام ایک "پیکیج" کا نام ہے۔ آپ کسی ایک ستون کو گرا کر باقی عمارت کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

معاشی بے برکتی اور زکوٰۃ: آج ہمارے معاشرے میں غربت اور بے برکتی کا ایک بڑا سبب زکوٰۃ کا صحیح نظام نہ ہونا ہے۔ اگر ہر صاحبِ نصاب شخص دیانت داری سے ڈھائی فیصد زکوٰۃ نکالے، تو معاشرے سے غربت کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ زکوٰۃ بوجھ نہیں بلکہ مال کی صفائی اور بڑھوتری کا ذریعہ ہے۔

صرف "رسم" یا "حقیقت": ہم نمازیں پڑھتے ہیں مگر ہماری زندگیوں میں تبدیلی نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان ارکان کو صرف "رسم" بنا لیا ہے۔ نماز ہمیں برائی سے روکتی ہے، روزہ ہمیں تقویٰ سکھاتا ہے، اور حج ہمیں امتِ واحدہ بناتا ہے۔ ہمیں ان ارکان کی روح کو سمجھنا ہوگا تاکہ ہماری عملی زندگی بہتر ہو سکے۔

خلاصہ درس:

اسلام صرف چند نظریات کا نام نہیں بلکہ ایک عملی زندگی ہے جس کے پانچ بنیادی تقاضے ہیں۔

کلمہ پڑھنے کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج (استطاعت کی صورت میں) کی پابندی ہر مسلمان پر لازم ہے۔

اپنی زندگی کی عمارت کا جائزہ لیں کہ کیا اس کے پانچوں ستون اپنی جگہ مضبوط ہیں یا ہم کسی سستی کی وجہ سے اپنی ہی عمارت کو کمزور کر رہے ہیں؟

درس نمبر:04۔حدیث نمبر:5

موضوع:ایمان کی شاخیں اور حیا کی اہمیت

عربی عبارت:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ». (متفق علیہ)

اردو ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"ایمان کی ستر سے کچھ اوپر (یا فرمایا ساٹھ سے کچھ اوپر) شاخیں ہیں۔ان میں سب سے افضل 'لا الہ الا اللہ' کہنا ہے،اور ان میں سب سے ادنی (نیچے والا درجہ) راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے،اور حیا بھی ایمان کی ایک (اہم) شاخ ہے۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. بِضْعٌ: عربی لغت میں تین سے لے کر نو تک کے عدد کو "بضع" کہا جاتا ہے۔یعنی ایمان کی شاخیں 73 سے 79 کے درمیان ہیں۔
2. شُعْبَةً: اس کا لغوی معنی شاخ (Branch) یا ٹکڑا ہے۔یہاں اس سے مراد ایمان کے وہ مختلف اعمال ہیں جن سے مل کر ایمان کامل ہوتا ہے۔
3. إِمَاطَةُ الْأَذَى: تکلیف دہ چیز کو دور کر دینا۔اس میں کانٹا، پتھر، گندگی یا ہر وہ چیز شامل ہے جو گزرنے والوں کے لیے رکاوٹ یا پریشانی کا باعث ہو۔
4. الحیاء: وہ کیفیت یا صفت جو انسان کو برے کاموں سے روکے اور اللہ کی نافرمانی سے بچنے پر ابھارے۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں ایمان کی جامعیت کو بیان کیا گیا ہے۔ایمان صرف چند عقائد کے مان لینے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک تناور درخت کی طرح ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں جو انسان کے عقیدے، زبان اور عمل تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اعلیٰ ترین عمل: ایمان کی جڑ اور سب سے بڑی شاخ "توحید" ہے۔جب تک انسان زبان اور دل سے اللہ کی وحدانیت کا اقرار نہیں کرتا، باقی شاخوں کا وجود ممکن نہیں۔

عمل کی اہمیت: راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کو ایمان کا حصہ قرار دے کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ اسلام صرف مسجد کی حد تک محدود نہیں بلکہ بندوں کی راحت کا خیال رکھنا بھی عین عبادت ہے۔

حیا کا مقام: حیا کو خاص طور پر الگ سے ذکر کیا گیا کیونکہ حیا وہ ڈھال ہے جو انسان کو گناہوں سے بچاتی ہے۔اگر حیا ختم ہو جائے تو ایمان کی باقی شاخیں بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتی ہیں۔فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ حیا کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان خلوت (تنہائی) میں بھی اللہ سے ویسے ہی شرم کرے جیسے وہ لوگوں کے سامنے کرتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ ایمان محض ایک کلمہ نہیں بلکہ ایک تناور درخت ہے جس کی شاخیں انسانی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں اللہ کی وحدانیت کا یقین ایمان کی بلندی ہے، وہیں حیا اختیار کرنا اور راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا اس بات کی دلیل ہے کہ سچا مومن وہی ہے جس کا وجود دوسروں کے لیے سراپا راحت اور خیر ہو۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

سڑکوں اور راستوں کے حقوق: آج ہم مسلمان ہونے کے باوجود صفائی اور راستے کے حقوق میں بہت پیچھے ہیں۔ گھر کا کوڑا سڑک پر پھینک دینا، غلط پارکنگ سے راستہ روکنا یا تعمیراتی سامان سڑک پر پھیلا دینا ایمان کی اس "ادنیٰ شاخ" کی بھی نفی کرتا ہے۔ ایک سچے مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے محلے اور راستے کو صاف ستھرا رکھنے میں اپنا کردار ادا کرے۔

ڈیجیٹل حیا: موجودہ دور میں موبائل اور سوشل میڈیا کا استعمال عام ہے۔ لوگ تنہائی میں ایسی چیزیں دیکھتے یا شیئر کرتے ہیں جو حیا کے خلاف ہوتی ہیں۔ یہ حدیث ہمیں یاد دلاتی ہے کہ حیا ایمان کی شاخ ہے؛ لہٰذا انٹرنیٹ کے استعمال میں بھی ویسا ہی وقار اور شرم و حیا ہونی چاہیے جو ایک مومن کا خاصہ ہے۔

معاشرتی ذمہ داری: ایمان ہمیں صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ دوسروں کی خیر خواہی سکھاتا ہے۔ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کا مطلب صرف پتھر ہٹانا نہیں بلکہ معاشرے سے ہر قسم کی برائی، ظلم اور فساد کو دور کرنے کی کوشش کرنا بھی اسی شاخ کا حصہ ہے۔

خلاصہ درس:

ایمان ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا تعلق زبان، دل اور عمل تینوں سے ہے۔

کسی بھی نیکی کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے، حتیٰ کہ راستے سے گندگی ہٹانا بھی اللہ کے ہاں معتبر ہے۔

اپنے اندر حیا کی صفت پیدا کریں، کیونکہ جس کے پاس حیا ہے اس کا ایمان محفوظ ہے۔

درس نمبر: 05۔ حدیث نمبر: 6

موضوع: کامل مسلمان اور حقیقی مہاجر کی پہچان

عربی عبارت:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ». (متفق علیہ)

اردو ترجمہ:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کی تکلیف) سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اور (کامل) مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. اَلْمُسْلِمُ (المسلم): لغت میں اس کا مطلب ہے "اطاعت کرنے والا" یا "اپنے آپ کو سپرد کرنے والا"۔ یہاں مراد "کامل مسلمان" ہے، نہ کہ صرف قانونی مسلمان۔
2. سَلِمَ (سلم): یہ "سلامتی" سے نکلا ہے، یعنی محفوظ رہنا۔

3. لِسَانِہٖ(لسانہ): اس کی زبان۔ عربی میں زبان سے مراد صرف بولنا نہیں بلکہ پیغام رسانی کے تمام ذرائع شامل ہوتے ہیں۔
4. اَلْمُھَاجِرُ(المہاجر): ہجرت کرنے والا۔ "ہجر" کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو چھوڑ دینا یا ترک کر دینا۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں حضور اکرم ﷺ نے اسلام اور ہجرت کی جامع اور عملی تعریف بیان فرمائی ہے۔ اس میں حقوق العباد اور تزکیہ نفس کے دو اہم اصول بیان کیے گئے ہیں۔

زبان کی سلامتی: حدیث میں "ہاتھ" سے پہلے "زبان" کا ذکر کیا گیا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ ہاتھ سے تکلیف دینا کبھی کبھی ہوتا ہے، لیکن زبان سے تکلیف دینا (طنز، غیبت، گالی، دل آزاری) ہر وقت ممکن ہے اور اس کا زخم تلوار کے زخم سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ نیز ہاتھ کی پہنچ محدود ہے جبکہ زبان (اور قلم/تحریر) کی پہنچ بہت دور تک ہوتی ہے۔

ہاتھ کی سلامتی: ہاتھ سے مراد انسان کی طاقت ہے۔ یعنی مسلمان وہ ہے جو اپنی طاقت کا ناجائز استعمال نہ کرے، نہ کسی کو مارے اور نہ کسی کا مال چھینے۔

کمالِ ایمان: یہاں "مسلم" سے مراد کامل مسلمان ہے۔ یعنی جو شخص نماز روزے کا پابند تو ہو لیکن لوگ اس کے شر سے پناہ مانگتے ہوں، وہ ناقص الایمان ہے۔

معنوی ہجرت: ہجرتِ مکانی (مکہ سے مدینہ) کا ثواب اپنی جگہ، لیکن یہ ہجرتِ معنوی (گناہوں کو چھوڑنا) قیامت تک جاری ہے۔ جو شخص برے ماحول میں رہتے ہوئے گناہ چھوڑ دے، وہ اللہ کے ہاں مہاجر کا درجہ پاتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ سچا مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان کی تکلیف سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ اسلام صرف چند ظاہری اعمال کا نام نہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ امن و سلامتی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرنا اور اللہ کی نافرمانیوں کو چھوڑ دینا ہی اصل ہجرت اور کمالِ ایمان ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

سوشل میڈیا اور زبان کی حفاظت: آج کے دور میں "زبان" کا دائرہ وسیع ہو کر فیس بک، واٹس ایپ اور ٹویٹر تک پھیل گیا ہے۔ اگر ہم کسی کے خلاف جھوٹی خبر پھیلاتے ہیں، کمنٹس میں بدتمیزی کرتے ہیں یا کسی کی تضحیک (Trolling) کرتے ہیں، تو ہم اس حدیث کی رو سے کامل مسلمان کی فہرست سے نکل جاتے ہیں۔ "کی بورڈ" کا استعمال بھی "زبان" کے حکم میں ہے۔

ہاتھ کا غلط استعمال: ہاتھ سے تکلیف دینے میں صرف مار پیٹ شامل نہیں، بلکہ دفتر میں قلم سے کسی کی فائل روکنا، ناجائز دستخط کرنا، یا کسی کا حق مارنا بھی "ہاتھ کی تکلیف" میں شامل ہے۔

گناہوں سے ہجرت: آج کل ہم کہتے ہیں کہ "معاشرہ بگڑ گیا ہے، ماحول خراب ہے"۔ یہ حدیث ہمیں راستہ دیتی ہے کہ ماحول کو نہ کوسیں بلکہ خود برائی کو چھوڑ دیں۔ اگر آپ سود، جھوٹ اور بددیانتی کے ماحول میں رہتے ہوئے ان چیزوں سے بچتے ہیں تو آپ اللہ کے راستے کے مہاجر ہیں۔

خلاصہ درس:

مسلمان کی پہچان صرف عبادت نہیں، بلکہ اعلیٰ اخلاق اور دوسروں کو تکلیف نہ دینا ہے۔

زبان کا زخم ہاتھ سے زیادہ خطرناک ہے، اس لیے بولنے (یا لکھنے) سے پہلے تولنا ضروری ہے۔

اللہ کی نافرمانی چھوڑ دینا سب سے بڑی ہجرت ہے، چاہے انسان اپنے گھر میں ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔

درس نمبر:06۔حدیث نمبر:7

موضوع: محبتِ رسول ﷺ تکمیلِ ایمان کی شرط

عربی عبارت:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ». (متفق علیہ)

اردو ترجمہ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. لَا يُؤْمِنُ (لا یومن): یہاں ایمان کی نفی سے مراد "ایمان کے کمال" کی نفی ہے، نہ کہ "ایمان کی اصل" کی۔ یعنی ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج تو نہیں ہوتا، لیکن وہ "کامل مومن" نہیں کہلا سکتا۔
2. أَحَبَّ (احب): یہ اسم تفضیل ہے، یعنی "زیادہ محبوب"۔ محبت کی تین اقسام ہیں:
   أ. محبتِ طبعی: (فطری محبت، جیسے بھوک پیاس یا اولاد کی محبت)۔
   ب. محبتِ عقلی: (کسی کی خوبیاں جان کر محبت کرنا)۔
   ج. محبتِ ایمانی: (اللہ اور اس کے رسول کی محبت)۔ یہاں مراد یہ ہے کہ محبتِ عقلی اور ایمانی اتنی غالب آ جائے کہ طبعی محبت پر حاوی ہو جائے۔
3. وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ (والدہ وولدہ): باپ اور بیٹا۔ ان رشتوں کا ذکر خاص طور پر کیا کیونکہ انسان کو دنیا میں سب سے زیادہ محبت انہی سے ہوتی ہے۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں ایمان کا ایک بہت بڑا معیار مقرر کیا گیا ہے۔ ایمان صرف کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جہاں اللہ کے نبی ﷺ کی ذات ہر چیز سے مقدم ہو جائے۔

محبت اور اطاعت کا تعلق: محبت صرف زبان سے دعویٰ کرنے کا نام نہیں ہے۔ محبت کی سب سے بڑی دلیل "اطاعت" ہے۔ اگر بیٹا کہے کہ میں باپ سے محبت کرتا ہوں مگر بات ایک نہ مانے، تو یہ محبت نہیں نافرمانی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کا حکم آ جائے تو پھر باپ کی بات سنی جائے نہ بیٹے کی، نہ برادری کی اور نہ ہی اپنی خواہش کی۔

فیصلہ کن مقام: انسان کا امتحان تب ہوتا ہے جب شریعت کا حکم ایک طرف ہو اور خاندان یا اولاد کی خواہش دوسری طرف۔ ایسے موقع پر اگر انسان نبی ﷺ کے حکم کو ترجیح دے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ "کامل مومن" ہے۔

تمام لوگوں سے زیادہ: اس میں دوست احباب، لیڈر، اساتذہ اور پوری دنیا شامل ہے۔ مومن کی نظر میں رسول اللہ ﷺ کی عزت اور حکم سب سے اوپر ہوتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ جب تک رسول اللہ ﷺ کی محبت انسان کے دل میں اپنی جان، مال، اولاد اور تمام دنیاوی رشتوں سے زیادہ نہ ہو جائے، اس کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ محبت محض جذباتی دعویٰ نہیں بلکہ آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرنے اور آپ ﷺ کے ارشادات کو ہر چیز پر مقدم رکھنے کا نام ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

شادی بیاہ اور رسومات: آج ہم شادیوں میں وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ہندوانہ رسمیں ہیں یا مغربی کلچر ہے۔ جب روکا جاتا ہے تو کہتے ہیں "ناک کٹ جائے گی، برادری کیا کہے گی"۔ یہاں ہم نے "برادری" کو "رسول اللہ ﷺ" سے زیادہ محبوب بنالیا (نعوذ باللہ)۔ اگر محبت سچی ہوتی تو ہم کہتے "ناک کٹتی ہے تو کٹ جائے، میرے نبی ﷺ کا طریقہ نہیں چھوٹنا چاہیے"۔

کاروبار اور سود: ہم جانتے ہیں کہ نبی ﷺ نے سود لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ لیکن ہم اولاد کے مستقبل کے لیے سودی قرضے لیتے ہیں۔ یہاں "اولاد کی محبت"، "رسول اللہ ﷺ کی محبت" پر غالب آ گئی۔ یہ ایمان کی کمزوری ہے۔

نام نہاد عشق اور عمل: آج کل عشقِ رسول کے نعرے تو بہت لگتے ہیں لیکن چہروں پر سنت نظر نہیں آتی، معاملات میں دیانت نہیں ملتی۔ سچا عاشق وہ ہے جو اپنی شکل و صورت اور لین دین میں محبوب (ﷺ) کی نقل کرنے کی کوشش کرے۔

خلاصہ درس:

ایمان تب مکمل ہوتا ہے جب دل میں سب سے زیادہ جگہ نبی کریم ﷺ کے لیے ہو۔

محبت کا امتحان اطاعت کے وقت ہوتا ہے۔

اگر دنیا کے کسی بھی رشتے اور نبی ﷺ کے حکم میں ٹکراؤ آ جائے، تو نبی ﷺ کے حکم کو اپنانا ہی اصل ایمان ہے۔

درس نمبر: 07۔ حدیث نمبر 8

موضوع: ایمان کی مٹھاس اور ذائقہ

عربی عبارت:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ». (متفق عليه)

اردو ترجمہ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تین خصلتیں (عادتیں) ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ پیدا ہو جائیں، وہ ایمان کی مٹھاس پالیتا ہے: (1) یہ کہ اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) اسے باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں، (2) یہ کہ وہ کسی شخص سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے کرے، اور (3) یہ کہ وہ کفر میں واپس جانے کو اتنا ہی ناپسند کرے جتنا آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. ثَلَاثٌ (تین): عربی گرائمر کے اعتبار سے یہ نکرہ ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی "خِصَالٌ ثَلَاثٌ" (تین خصلتیں)۔

2. حَلَاوَۃَ(مٹھاس): یہاں مٹھاس سے مراد "لذتِ ایمانی" ہے۔ جیسے شہد کا ذائقہ زبان محسوس کرتی ہے، ویسے ہی ایمان کا ذائقہ دل محسوس کرتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جب طاعت میں مشقت محسوس نہ ہو بلکہ مزہ آنے لگے تو یہ حلاوتِ ایمانی ہے۔
3. یُقْذَفَ(ڈالا جائے): یہ "قذف" سے ہے، جس کا مطلب ہے کسی چیز کو زور سے پھینکنا۔

تشریح:

اس حدیث میں ایمان کے "کمال" اور اس کی "روح" کا ذکر ہے۔ ایمان صرف خشک عقائد کا نام نہیں بلکہ یہ ایک قلبی کیفیت اور ذوق ہے۔

اللہ اور رسول کی محبت: مومن کا دل دو محبتوں کا مرکز نہیں ہو سکتا۔ جب تک تمام دنیاوی محبتیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے تابع نہ ہوں، ایمان کی مٹھاس نصیب نہیں ہوتی۔

محبت اللہ کے لیے (الحب للہ): یہ ایمان کا بہت اونچا درجہ ہے۔ عام طور پر ہم محبت یا تو رشتہ داری کی وجہ سے کرتے ہیں یا دنیاوی فائدے کے لیے۔ حدیث کا منشا یہ ہے کہ آپ کی دوستی کا معیار "تقویٰ" ہو۔ اگر کوئی اللہ کا نیک بندہ ہے تو اس سے محبت ہو، چاہے اس سے کوئی دنیاوی فائدہ نہ بھی ہو۔

کفر سے نفرت: ایمان کی مٹھاس تب ملتی ہے جب انسان گناہ اور کفر سے اتنی شدید نفرت کرے جیسے کوئی جلتی ہوئی آگ میں چھلانگ لگانے سے ڈرتا ہے۔ جب گناہ کا خیال آنے پر دل کانپ جائے تو سمجھیں کہ ایمان کی حلاوت مل گئی۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ ایمان کی مٹھاس اور لذت صرف ان خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی ہے جن کی زندگی کا مرکز و محور اللہ اور اس کے رسول کی رضا بن جائے۔ جو لوگ اللہ کی خاطر محبت اور دشمنی رکھتے ہیں اور کفر کی طرف لوٹنے کو آگ میں گرنے کے برابر ناپسند کرتے ہیں، اللہ ان کے دلوں کو ایمان کے نور اور حلاوت سے منور فرما دیتا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

مفاد پرستی کی دوستیاں: آج کل ہمارے تعلقات کی بنیاد "مطلب" پر ہے۔ ہم امیر اور عہدے دار لوگوں سے تعلقات بڑھاتے ہیں اور غریب رشتہ داروں یا نیک لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ یہ "ایمان کی مٹھاس" سے محرومی کی بڑی وجہ ہے۔ ہمیں اپنے دوستوں کا انتخاب کرتے وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ "کون مجھے اللہ کے قریب کر رہا ہے؟"

عبادت میں سستی: ہم شکایت کرتے ہیں کہ نماز میں دل نہیں لگتا یا قرآن پڑھنے میں لطف نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دل دنیا کی محبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ جب "اللہ اور اس کا رسول" سب سے زیادہ محبوب بن جائیں گے تو پھر اذان کی آواز سن کر دل خوشی سے جھوم اٹھے گا، بوجھ محسوس نہیں کرے گا۔

گناہ پر ندامت کا فقدان: آج ہم گناہ کر کے ہنستے ہیں اور فخر سے بتاتے ہیں۔ یہ کیفیت اس بات کی علامت ہے کہ دل سے ایمان کی مٹھاس نکل چکی ہے۔ ہمیں اپنے اندر وہ کیفیت پیدا کرنی ہے کہ جھوٹ بولنا یا حرام کھانا ہمیں آگ کے انگارے نگلنے جیسا لگے۔

درس نمبر: 08۔ حدیث نمبر 9

موضوع: ایمان کا ذائقہ اور اللہ پر راضی ہونا

عربی عبارت:

عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «ذَاقَ طَعْمَ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللَّهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولًا». (رواہ مسلم)

اردو ترجمہ:

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "اس شخص نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد (ﷺ) کے رسول ہونے پر راضی ہو گیا۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. ذَاقَ (چکھا): جس طرح انسان زبان سے چکھ کر مٹھاس یا کڑواہٹ محسوس کرتا ہے، اسی طرح روح بھی "ایمان" کا ذائقہ محسوس کرتی ہے۔ یہ محض جاننے کا نام نہیں بلکہ "وجدان" (Feeling) کا نام ہے۔
2. رَضِيَ (راضی ہوا): عربی میں "رضا" کا مطلب ہے دل کا مطمئن ہو جانا۔ یعنی کسی چیز کو قبول کرنا اور اس پر خوشی محسوس کرنا، نہ کہ مجبوری میں ماننا۔
3. رَبًّا (رب ہونے پر): رب کا معنی ہے "پالنے والا، مالک اور مدبر"۔ یعنی یہ مان لینا کہ میری زندگی کے تمام فیصلے صرف وہی ذات کر سکتی ہے۔

تشریح:

گزشتہ حدیث میں "ایمان کی مٹھاس" (حلاوت) کا ذکر تھا، اور اس حدیث میں "ایمان کا ذائقہ" (طعم) کا ذکر ہے۔ دونوں کا مفہوم ملتا جلتا ہے لیکن یہاں شرط مختلف ہے۔ یہاں ایمان کا ذائقہ پانے کے لیے تین چیزوں پر "راضی" ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے:

اللہ پر راضی ہونا: اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کی تقسیم اور اس کے فیصلوں پر دل سے خوش ہو۔ اگر وہ مال دے تو بھی راضی، اگر لے لے تو بھی راضی۔ جو شخص اللہ کے ہر فیصلے (تقدیر) پر "الحمدللہ" کہتا ہے، وہی دراصل اللہ کو رب ماننے پر راضی ہے۔

اسلام پر راضی ہونا: یعنی اسلام کو صرف ایک مذہب نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات سمجھنا۔ یہ احساس ہونا کہ "اسلام ہی میرے لیے کافی ہے، مجھے عزت، قانون اور رہنمائی کے لیے کسی اور نظام (سوشلزم، کیپٹلزم یا مغربی کلچر) کی ضرورت نہیں۔"

محمد ﷺ پر راضی ہونا: یعنی آپ ﷺ کی ذات کو اپنا واحد پیشوا اور آئیڈیل مان لینا۔ زندگی کے ہر موڑ پر یہ دیکھنا کہ "میرے نبی ﷺ کا طریقہ کیا ہے" اور اس پر مطمئن ہو جانا، چاہے دنیا کچھ بھی کہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ ایمان کا اصل ذائقہ اس شخص کے حصے میں آتا ہے جو اللہ کی ربوبیت، اسلام کی حقانیت اور محمد ﷺ کی رسالت پر دلی طور پر مطمئن اور راضی ہو جائے۔ یہ قلبی رضا ہی انسان کو بندگی کے اس مقام پر پہنچاتی ہے جہاں اسے عبادت بوجھ نہیں بلکہ راحت محسوس ہونے لگتی ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

احساسِ کمتری (Inferiority Complex): آج کا مسلمان "اسلام" پر راضی نظر نہیں آتا۔ ہم مغربی تہذیب، ان کے لباس اور ان کے لائف اسٹائل سے اتنے مرعوب ہیں کہ ہمیں اپنا اسلامی تشخص (Identity) چھپاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایمان کا ذائقہ اسے ملے گا جو فخر سے کہے کہ "میں مسلمان ہوں اور اسلام میرا دین ہے"۔

شکوہ و شکایت: ہماری زبانوں پر ہر وقت شکوے رہتے ہیں۔ "اللہ نے مجھے یہ کیوں نہیں دیا؟"، "میرے ساتھ ہی برا کیوں ہوا؟"۔ یہ جملے بتاتے ہیں کہ ہم "اللہ کے رب ہونے پر" راضی نہیں ہیں۔ جو شخص راضی ہو جاتا ہے، اس کی زبان شکوے سے بند اور شکر سے جاری ہو جاتی ہے۔ پریشانی میں "صبر" اور نعمت میں "شکر" ہی رضا کی علامت ہے۔

غیروں کے طریقوں کی تلاش: ہم اپنی معیشت، سیاست اور عدالت کے لیے غیر مسلموں کے قوانین کی طرف دیکھتے ہیں۔ اگر ہم واقعی "محمد ﷺ کے رسول ہونے پر" راضی ہوتے تو ہم حل صرف مدینہ کی ریاست اور سیرتِ طیبہ میں تلاش کرتے۔

خلاصہ درس:

ایمان محض کلمہ پڑھنے کا نام نہیں، بلکہ اللہ کے فیصلوں پر دل کے سکون کا نام ہے۔

جو شخص اپنے رب، اپنے دین اور اپنے نبی ﷺ پر فخر محسوس نہیں کرتا، وہ ایمان کے حقیقی ذائقے سے محروم ہے۔

اپنی پہچان (Identity) پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔

درس نمبر: 09۔ حدیث 11

موضوع: وہ تین خوش نصیب جن کے لیے دوہرا اجر ہے

عربی عبارت:

وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ، وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ إِذَا أَدَّى حَقَّ اللَّهِ وَحَقَّ مَوَالِيهِ، وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ يَطَؤُهَا فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا، وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا، ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا، فَلَهُ أَجْرَانِ». (متفق عليه)

اردو ترجمہ:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کے لیے دوہرا اجر ہے:

1. وہ اہل کتاب (یہودی یا عیسائی) جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور پھر (ان کے بعد) محمد (ﷺ) پر بھی ایمان لایا۔
2. وہ غلام جو اللہ کا حق بھی ادا کرے اور اپنے آقاؤں کا حق بھی ادا کرے۔
3. اور وہ شخص جس کے پاس کوئی باندی (لونڈی) ہو جس سے وہ صحبت کرتا ہو، پھر وہ اسے ادب سکھائے اور خوب اچھا ادب سکھائے، اور اسے تعلیم دے اور خوب اچھی تعلیم دے، پھر اسے آزاد کر دے اور اس سے نکاح کر لے، تو اس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. أَجْرَانِ (دو اجر): یہ "اجر" کا تثنیہ ہے۔ یعنی ان کے عمل کی مشقت یا اہمیت کی وجہ سے انہیں عام لوگوں سے دگنا ثواب ملے گا۔
2. أَهْلِ الْكِتَابِ: اس سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔ اپنے نبی پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی شریعت پر (تحریف سے پہلے) یا سچے دل سے قائم تھے، اور جب اسلام آیا تو تعصب چھوڑ کر مسلمان ہو گئے۔
3. أَدَّبَهَا (اسے ادب سکھایا): "ادب" سے مراد اخلاقی تربیت، رہن سہن کے طریقے اور معاشرتی آداب ہیں۔
4. عَلَّمَهَا (اسے علم سکھایا): اس سے مراد دینی احکامات (حلال و حرام) کا علم ہے۔

تشریح:

اس حدیث میں تین ایسے طبقات کا ذکر ہے جنہوں نے دوہری ذمہ داری نبھائی یا دوہری رکاوٹیں عبور کیں، اس لیے اللہ نے ان کا انعام بھی ڈبل کر دیا۔

تعصب ختم کرنے والا اہل کتاب: اپنا آبائی مذہب چھوڑنا بہت مشکل کام ہے۔ایک شخص پہلے حضرت موسیٰؑ یا عیسیٰؑ پر ایمان رکھتا تھا،جب اسے پتہ چلا کہ آخری نبی ﷺ آگئے ہیں،تو اس نے ضد نہیں کی بلکہ اسلام قبول کر لیا۔اس کے لیے دو اجر ہیں:ایک پہلے نبی پر ایمان لانے کا اور دوسرا نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا۔

وفادار غلام (ملازم): یہ شخص دوہری ڈیوٹی دے رہا ہے۔ایک طرف مالک کی خدمت اور اطاعت میں لگا ہے اور دوسری طرف اللہ کی عبادت میں کوتاہی نہیں کرتا۔عام طور پر انسان کام کاج میں لگ کر نماز بھول جاتا ہے،لیکن یہ بندہ حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں میں توازن رکھتا ہے۔

عورت کا مقام بلند کرنے والا: تیسرا شخص وہ ہے جس نے غلام عورت (جسے معاشرے میں حقیر سمجھا جاتا تھا) کو صرف "استعمال" نہیں کیا، بلکہ:اس کی بہترین تعلیم و تربیت کی۔پھر اسے آزادی دی۔پھر اسے اپنے گھر کی ملکہ (بیوی) بنایا۔یہ اسلام کی سماجی اصلاح کا عظیم کارنامہ ہے کہ غلام کو بھی "تعلیم" اور "عزت" کا حقدار ٹھہرایا۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو دوہرا اجر عطا فرماتا ہے جو اخلاص کے ساتھ اپنی دوہری ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں۔یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ اسلام علم کی ترویج،غلاموں کی آزادی اور ہر حال میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

نو مسلموں (Converts) کا احترام: آج بھی جو غیر مسلم اپنا مذہب چھوڑ کر،خاندان کی مخالفت برداشت کر کے مسلمان ہوتے ہیں،ان کا اجر بہت زیادہ ہے۔ہمیں چاہیے کہ ہم ان کا اکرام کریں،انہیں اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیں اور انہیں اپنے معاشرے میں ضم کریں۔

ملازم اور ڈیوٹی: آج کل غلامی کا وہ نظام تو نہیں رہا،لیکن "ملازمت" (Employment) موجود ہے۔اگر کوئی ملازم اپنے باس/کمپنی کا کام ایمانداری سے کرتا ہے (خیانت یا کام چوری نہیں کرتا) اور ساتھ ہی اپنی نمازوں اور دین کا بھی پکا ہے،تو وہ اس بشارت کا مستحق ہے۔یعنی رزقِ حلال کمانے والا عابد دوہرے اجر کا مستحق ہے۔

خواتین کی تعلیم: حدیث میں باندی کو "اچھی تعلیم اور اچھا ادب" سکھانے پر اجر کا وعدہ ہے۔جب ایک باندی تعلیم کی حقدار ہے،تو ہماری اپنی بیٹیاں اور بیویاں تعلیم و تربیت کی کتنی زیادہ حقدار ہوں گی؟ یہ حدیث ان لوگوں کی تردید کرتی ہے جو عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہیں۔اسلام تو عورت کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر عزت کے مقام پر لانے والا دین ہے۔

درس نمبر:10۔حدیث 12

موضوع: کلمہ گو کی جان و مال کا تحفظ

عربی عبارت:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ». (متفق عليه)

اردو ترجمہ:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مجھے (اللہ کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے (اس وقت تک) لڑوں جب تک کہ وہ اس بات کی گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں،اور نماز قائم

کریں اور زکوۃ ادا کریں۔ پس جب وہ یہ کام کر لیں تو انہوں نے مجھ سے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ کر لیا، سوائے اسلام کے حق کے (یعنی اگر اسلام کا کوئی شرعی حق یا سزا ان پر لاگو ہو تو وہ دی جائے گی)، اور ان کا (باطنی) حساب اللہ کے ذمے ہے۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. اُمِرْتُ (مجھے حکم دیا گیا): یہ فعل مجہول ہے، یعنی مجھے حکم دینے والا "اللہ" ہے۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ میرا ذاتی فیصلہ نہیں بلکہ وحیِ الٰہی ہے۔
2. اُقَاتِلَ (میں لڑوں): یہاں لفظ "قَتْل" (جان سے مارنا) نہیں ہے، بلکہ "قِتَال" (لڑائی کرنا) ہے۔ یہ حکم خاص طور پر جزیرۃ العرب کے مشرکین کے لیے تھا تاکہ شرک کا زور ٹوٹے۔
3. عَصَمُوا (انہوں نے محفوظ کر لیا): یہ "عصمت" سے ہے، جس کا مطلب ہے بچاؤ اور حفاظت۔ یعنی اسلام لاتے ہی ان کا خون اور مال "حرام" (قابلِ احترام) ہو گیا۔
4. حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ (ان کا حساب اللہ پر ہے): یعنی ہم صرف ظاہر کے پابند ہیں، دل میں کیا چھپا ہے (سچائی یا منافقت)، اس کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ کرے گا۔

تشریح:

یہ حدیث اسلامی ریاست کے قانون اور شہری حقوق (Rights of Citizen) کی بنیاد ہے۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ کسی شخص کے مسلمان مانے جانے اور اس کی جان و مال کے تحفظ کے لیے کون سی چیزیں ضروری ہیں۔

اسلام کے تین بنیادی ستون: حدیث میں صرف کلمہ پڑھنے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ "نماز" اور "زکوۃ" کا ذکر بھی ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست میں شہریت کے مکمل حقوق کے لیے عقیدے کے ساتھ ساتھ عملی اطاعت (نماز و زکوۃ) بھی ضروری ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے مانعینِ زکوۃ (زکوۃ نہ دینے والوں) کے خلاف جہاد کیا تھا۔

ظاہر پر فیصلہ: شریعت کا سنہری اصول یہ ہے: "نَحْنُ نَحْكُمُ بِالظَّوَاهِرِ" (ہم ظاہر پر فیصلہ کرتے ہیں)۔ اگر کوئی شخص زبان سے کلمہ پڑھتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، تو ہم اسے مسلمان ہی سمجھیں گے، چاہے اس کے دل میں نفاق ہی کیوں نہ ہو۔ دل چیر کر دیکھنے کا ہمیں حکم نہیں ہے۔

قانون کی بالادستی (الا بحق الاسلام): "سوائے اسلام کے حق کے" کا مطلب یہ ہے کہ کلمہ پڑھنے سے جان محفوظ تو ہو گئی، لیکن اگر وہ کوئی ایسا جرم کرے جس کی سزا اسلام میں موت ہے (جیسے شادی شدہ ہو کر زنا کرنا، یا ناحق کسی کو قتل کرنا)، تو پھر قانون حرکت میں آئے گا اور اسے سزا دی جائے گی۔ یہ "استثنیٰ" (Exception) ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اسلام میں انسانی جان اور مال کا احترام انتہا درجے کا ہے، لیکن اس کے مکمل تحفظ کی بنیاد اللہ کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی رسالت کی گواہی کے ساتھ ساتھ عملی طور پر نماز کی پابندی اور زکوۃ کی ادائیگی پر رکھی گئی ہے۔ یہ ہمیں یہ بصیرت عطا کرتا ہے کہ جب ایک شخص شعائرِ اسلام کو اپنا لیتا ہے، تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پناہ میں آ جاتا ہے اور کسی بھی دوسرے شخص کو اس کے خون یا مال سے چھیڑ چھاڑ کی اجازت نہیں رہتی۔ مزید یہ کہ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ دین کا ظاہری نظام بندوں کے سپرد ہے جبکہ دلوں کے اصل احوال اور نیتوں کا فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا، اس لیے ہمیں دوسروں کی نیتوں پر شک کرنے کے بجائے ان کی ظاہری اطاعت کا احترام کرنا چاہیے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

تکفیر کا فتنہ (کافر قرار دینا): آج کل جذباتی نوجوان یا انتہا پسند گروہ معمولی اختلافات پر کلمہ گو مسلمانوں کو "کافر" یا "مشرک" کہہ کر ان کا خون حلال سمجھتے ہیں۔ یہ حدیث ان کے لیے کھلا رد ہے کہ جب تک کوئی نماز اور زکوۃ کا پابند ہے، اس سے لڑنا یا اسے مارنا حرام ہے۔

ریاست کی ذمہ داری: یہ حدیث بتاتی ہے کہ "قتال" (لڑنے) یا "سزا دینے" کا اختیار صرف "امام" (ریاست/حکمران) کے پاس ہے ("أُمِرْتُ" کا صیغہ حکمران کی طرف اشارہ ہے)۔ کوئی عام آدمی یا جتھا اٹھ کر لوگوں کو سزائیں نہیں دے سکتا۔

مال کا تحفظ: حدیث میں "جان" کے ساتھ "مال" کا ذکر بھی ہے۔ کسی مسلمان کا مال لوٹنا، قبضہ کرنا یا دھوکے سے کھانا اتنا ہی بڑا گناہ ہے جتنا اسے قتل کرنا۔

خلاصہ درس:

کلمہ طیبہ، نماز اور زکوۃ، یہ تینوں چیزیں جان و مال کے تحفظ کی ضمانت ہیں۔

کسی بھی کلمہ گو مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھانا حرام ہے، جب تک کہ وہ کسی شرعی جرم (حد یا قصاص) کا مرتکب نہ ہو۔

ہمیں لوگوں کے ظاہر پر فیصلہ کرنا چاہیے، دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے۔

درس نمبر: 11۔ حدیث 13

موضوع: مسلمان کی تین ظاہری نشانیاں اور اللہ کی ذمہ داری

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ صَلَّى صَلَاتَنَا، وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا، وَأَكَلَ ذَبِيحَتَنَا، فَذَلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِي لَهُ ذِمَّةُ اللَّهِ وَذِمَّةُ رَسُولِهِ، فَلَا تُخْفِرُوا اللَّهَ فِي ذِمَّتِهِ». (رواه البخاري)

اردو ترجمہ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے ہماری (طرح) نماز پڑھی، اور ہمارے قبلہ (خانہ کعبہ) کی طرف رخ کیا، اور ہمارا ذبیحہ (مسلمان کا ذبح کیا ہوا جانور) کھایا، تو یہ وہ مسلمان ہے جس کے لیے اللہ کی پناہ (ذمہ داری) ہے اور اس کے رسول کی پناہ ہے۔ پس تم اللہ کے ساتھ اس کی پناہ (ذمہ داری) میں خیانت (عہد شکنی) نہ کرو۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. صَلَاتَنَا (ہماری نماز): یعنی مسلمانوں کے طریقے کے مطابق نماز پڑھنا (ارکان و شرائط کے ساتھ)۔
2. اسْتَقْبَلَ (رخ کیا): "استقبال" کا مطلب ہے سامنے ہونا۔ قبلہ کی طرف رخ کرنا شعائرِ اسلام میں سے ہے۔
3. ذَبِيحَتَنَا (ہمارا ذبیحہ): یعنی وہ جانور جسے "بسم اللہ اللہ اکبر" پڑھ کر مسلمانوں کے طریقے پر ذبح کیا گیا ہو۔ یہ مسلمانوں کو مشرکین (جو بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے) اور اہل کتاب سے ممتاز کرتا ہے۔
4. ذِمَّةُ (ذمہ/پناہ): "ذمہ" کا مطلب ہے عہد، امان اور گارنٹی۔ یعنی ایسے شخص کی جان و مال کی حفاظت اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اپنے ذمے لے لی ہے۔
5. لَا تُخْفِرُوا (خیانت نہ کرو): یہ لفظ "اِخْفَار" سے ہے، جس کا مطلب ہے کسی کے عہد کو توڑ دینا یا کسی کی دی ہوئی پناہ کو پامال کرنا۔

تشریح:

یہ حدیث اس بات کا معیار مقرر کرتی ہے کہ ہمیں معاشرے میں کس شخص کو "مسلمان" سمجھنا ہے اور اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا ہے۔

ظاہری اسلام: شریعت نے کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ اس کے "ظاہر" پر رکھا ہے۔ جو شخص اعلانیہ طور پر شعائرِ اسلام (نماز، قبلہ، حلال کھانا) کو اپناتا ہے، اسے مسلمان سمجھا جائے گا۔ ہمیں اس کے دل ٹٹولنے کا حکم نہیں ہے۔

تین بنیادی شناخت:

1. نماز: یہ سب سے بڑی جسمانی عبادت ہے۔
2. قبلہ: یہ مسلمانوں کی وحدت (Unity) کی علامت ہے۔ چاہے مشرق میں ہو یا مغرب میں، سب ایک ہی گھر کی طرف رخ کرتے ہیں۔
3. ذبیحہ: یہ مسلمانوں کی معاشرتی اور ثقافتی پہچان ہے۔ غیر مسلموں کا ذبیحہ حرام ہے (سوائے اہل کتاب کے خاص شرائط کے ساتھ)، اس لیے "مسلمان کا ذبیحہ کھانا" اسے پوری قوم سے جوڑ دیتا ہے۔

اللہ کی گارنٹی: جو شخص یہ تین کام کرلے، وہ اللہ کی "سیکیورٹی" میں آگیا۔ اب اگر کوئی شخص اس مسلمان کو ناحق تکلیف دے گا، اس کا مال لوٹے گا یا اسے کافر کہے گا، تو وہ دراصل اللہ کے دیے ہوئے "عہد" کو توڑ رہا ہے، جو کہ بہت بڑا جرم ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی پہچان کچھ خاص ظاہری علامتوں اور اعمال سے وابستہ ہے، جیسے ہماری طرح نماز پڑھنا، ہمارے قبلہ (کعبہ) کی طرف رخ کرنا اور ہمارے ذبیحہ کو حلال سمجھ کر کھانا۔ یہ اعمال درحقیقت ایک بندے کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے عہد و پیمان (ذمہ) میں داخل کر دیتے ہیں، جو اسے معاشرے میں ہر قسم کے ناحق ظلم اور خوف سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یہ ہمیں اس بات سے سخت خبردار کرتا ہے کہ جس شخص کو اللہ نے اپنی پناہ میں لے لیا ہو، اس کی جان یا عزت کی بے حرمتی کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے گئے عہد کی غداری ہے، لہٰذا ایک سچے اسلامی معاشرے میں ہر اس شخص کی عزت و جان کا تحفظ کرنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے جو اسلامی طرزِ زندگی کو اپنائے ہوئے ہو۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

حلال و حرام کی تمیز: آج کل ہم کھانے پینے میں بے احتیاط ہو گئے ہیں۔ "ہمارا ذبیحہ کھانا" مسلمان کی پہچان ہے۔ غیر ممالک میں یا مشکوک ہوٹلوں میں بغیر تحقیق کے گوشت کھانا اس حدیث کی رو سے اپنی اسلامی شناخت کو کمزور کرنا ہے۔

تکفیر سے بچنا: آج کل فرقہ واریت کی وجہ سے ہم دوسروں کو بہت جلدی کافر قرار دے دیتے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں روکتی ہے کہ جو "اہلِ قبلہ" ہو (یعنی ہمارے قبلے کی طرف نماز پڑھتا ہو)، اسے کافر کہنا جائز نہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ جب تک کسی شخص کے کفر کی کھلی دلیل نہ ملے، اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔

مسلمان کی عزت: ہمیں ہر اس شخص کی جان، مال اور عزت کا احترام کرنا چاہیے جو کلمہ گو اور نمازی ہے۔ ایسے شخص کی غیبت کرنا یا اسے نقصان پہنچانا اللہ کے عہد کو توڑنے کے مترادف ہے۔

خلاصہ درس:

جو شخص نماز پڑھے، خانہ کعبہ کو قبلہ مانے اور حلال ذبیحہ کھائے، وہ پکا مسلمان ہے۔

ایسے شخص کی حفاظت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذمے ہے۔

کسی مسلمان کو تکلیف دینا اللہ کے عہد اور امان میں خیانت کرنا ہے۔

درس نمبر:12۔حدیث14

موضوع:فرائض کی پابندی جنت کی ضمانت ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أَتَى أَعْرَابِيٌّ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ. قَالَ: «تَعْبُدُ اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا، وَتُقِيمُ الصَّلَاةَ الْمَكْتُوبَةَ، وَتُؤَدِّي الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ، وَتَصُومُ رَمَضَانَ». قَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا أَزِيدُ عَلَى هَذَا شَيْئًا وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُ. فَلَمَّا وَلَّى قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى رَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى هَذَا». (متفق علیہ)

اردو ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی (اعرابی) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے کہ جب میں اسے کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "(وہ عمل یہ ہے کہ) تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور فرض نماز قائم کرو، اور فرض زکوۃ ادا کرو، اور رمضان کے روزے رکھو۔" اس (دیہاتی) نے کہا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! میں اس پر نہ کوئی زیادتی (اضافہ) کروں گا اور نہ اس میں کوئی کمی کروں گا۔" جب وہ پیٹھ پھیر کر چلا گیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جسے یہ بات پسند ہو (یا خوشی دے) کہ وہ کسی جنتی آدمی کو دیکھے، تو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. أَعْرَابِيٌّ (اعرابی): اس سے مراد دیہاتی یا بدو ہے جو شہر سے دور رہتے تھے۔ یہ لوگ اپنی بات چیت میں سیدھے سادے اور کھرے ہوتے تھے۔
2. الْمَكْتُوبَةَ (لکھی ہوئی): اس سے مراد "فرض نمازیں" (پنجگانہ نماز) ہیں۔ نوافل اس میں شامل نہیں۔
3. الْمَفْرُوضَةَ (فرض کی ہوئی): اس سے مراد ڈھائی فیصد زکوۃ ہے جو صاحبِ نصاب پر فرض ہے۔ نفلی صدقہ و خیرات اس کے علاوہ ہے۔
4. لَا أَزِيدُ (میں اضافہ نہیں کروں گا): یعنی میں صرف فرائض ادا کروں گا، نفل یا سنتیں نہیں پڑھوں گا۔
5. وَلَا أَنْقُصُ (اور نہ کمی کروں گا): یہ بہت اہم جملہ ہے۔ یعنی میں فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا، انہیں پورا پورا ادا کروں گا۔

تشریح:

یہ حدیث دینِ اسلام کی آسانی اور "فرائض" کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔

نجات کا مدار فرائض پر ہے: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت میں جانے کے لیے "فرائض" (Obligatory Acts) کی پابندی اور "کبیرہ گناہوں" (شرک وغیرہ) سے بچنا کافی ہے۔ نوافل (Nafl) انسان کے درجات بلند کرتے ہیں، لیکن نجات کی بنیاد فرائض کی ادائیگی ہے۔

سادگی میں خوبصورتی: نبی کریم ﷺ نے اس دیہاتی کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اسے لمبی چوڑی عبادات یا مشکل وظائف نہیں بتائے، بلکہ دین کا نچوڑ (Basic Pillars) بتا دیا۔ اسلام ہر طبقے کے لیے آسان دین ہے۔

استقامت کی شرط: بظاہر لگتا ہے کہ صرف فرض پڑھنا آسان ہے، لیکن اس شخص کی کامیابی کی اصل وجہ اس کا یہ عہد تھا کہ "میں اس میں کمی نہیں کروں گا"۔ یعنی چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ نماز، روزہ اور زکوۃ نہیں چھوڑے گا۔ یہی "استقامت" (Consistency) اسے جنت میں لے گئی۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ جنت تک پہنچنے کا راستہ نہایت واضح اور سادہ ہے، بشرطیکہ انسان دین کے بنیادی ارکان یعنی توحید، نماز، زکوۃ اور روزے پر اخلاص کے ساتھ سختی سے قائم رہے۔ یہ حدیث ہمیں یہ اطمینان دلاتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان فرائض میں کوتاہی نہ کرے

اور اللہ کی حدود میں اضافہ یا کمی نہ کرنے کا پختہ عزم کرلے، تو وہ اللہ کے فضل سے ابدی کامیابی کا حقدار ٹھہرتا ہے، چاہے وہ بہت زیادہ نفلی عبادات کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ حضور ﷺ کا اس دیہاتی کو "اہلِ جنت" میں سے قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اصل کمال بہت زیادہ اعمال کی نمائش میں نہیں بلکہ دین کی بنیادوں کو مضبوطی سے تھامنے اور ان پر ثابت قدم رہنے میں ہے، جو انسان کو اللہ کا محبوب بندہ بنا دیتی ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

اولین ترجیح (Priorities):

آج کل ہم نوافل اور مستحبات پر تو بہت زور دیتے ہیں (جیسے بڑی بڑی محفلیں کرانا، نفل عمرے کرنا)، لیکن فرض نمازوں اور زکوۃ میں سستی کرتے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کے ہاں "فرض" کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ پہلے فرض پورا کریں، پھر نفل کی طرف جائیں۔

دین کو مشکل نہ بنائیں: جب کوئی نیا مسلمان ہو یا کوئی گناہ گار توبہ کرے، تو ہمیں اسے شروع میں ہی بہت زیادہ نوافل اور وظائف کے بوجھ تلے نہیں دبانا چاہیے۔ اسے پہلے فرائض پر پکا کریں، جیسا کہ نبی ﷺ نے اس اعرابی کے ساتھ کیا۔

مقدار نہیں، معیار: وہ شخص صرف فرائض ادا کر رہا تھا لیکن "پکے ارادے" کے ساتھ۔ ہم بہت کچھ کرتے ہیں لیکن استقامت نہیں ہوتی۔ تھوڑا عمل جو ہمیشگی کے ساتھ ہو، وہ اس زیادہ عمل سے بہتر ہے جو کچھ دن بعد چھوٹ جائے۔

خلاصہ درس:

اللہ کی عبادت اور شرک سے بچنا جنت کی کنجی ہے۔

صرف فرائض (نماز، روزہ، زکوۃ) کی پابندی بھی انسان کو جنت میں لے جانے کے لیے کافی ہے۔

دین میں اصل چیز "استقامت" (پکے رہنا) ہے، چاہے عمل تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

درس نمبر: 13۔ حدیث 18

موضوع: اسلامی بیعت کے چھ بنیادی اصول اور گناہوں کا کفارہ

وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِنْ أَصْحَابِهِ: «بَايِعُونِي عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا، وَلَا تَسْرِقُوا، وَلَا تَزْنُوا، وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ، وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ، وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ، فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ بِهِ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ إِلَى اللَّهِ: إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ» فَبَايَعْنَاهُ عَلَى ذَلِكَ. (متفق عليه)

اردو ترجمہ:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جبکہ آپ ﷺ کے ارد گرد صحابہ کرام کی ایک جماعت موجود تھی: "تم مجھ سے اس بات پر بیعت (عہد) کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، اور نہ چوری کرو گے، اور نہ زنا کرو گے، اور نہ اپنی اولاد کو قتل کرو گے، اور نہ کوئی ایسا بہتان (جھوٹا الزام) تراشو گے جسے تم اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ لاؤ، اور نہ کسی بھلی بات (معروف) میں نافرمانی کرو گے۔ پس تم میں سے جو (اس عہد کو) پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، اور جو شخص ان (گناہوں) میں سے کسی چیز کا ارتکاب کر بیٹھے اور پھر اسے دنیا میں اس کی سزا دے دی جائے تو یہ سزا اس کے لیے (اس گناہ کا) کفارہ (پاکیزگی) ہو جائے گی، اور جو شخص ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کرے پھر اللہ اس (کے گناہ) پر پردہ ڈال دے (یعنی دنیا میں سزا نہ ملے) تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے: اگر چاہے تو اسے معاف کر دے اور اگر چاہے تو اسے سزا دے۔" تو ہم نے آپ ﷺ سے ان باتوں پر بیعت کی۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1. عِصَابَةٌ(جماعت):دس سے چالیس افراد کے گروہ کو کہتے ہیں۔
2. بَايِعُونِي(مجھ سے بیعت کرو):"بیعت"کالفظ"بیع"(خرید وفروخت)سے نکلا ہے۔گویا بندہ اپنی جان ومال جنت کے بدلے اللہ کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے۔
3. بُهْتَانٍ(بہتان):ایسا سفید جھوٹ یا الزام جس سے سننے والا ہکا بکا(حیران)رہ جائے۔
4. بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ(تمہارے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان):یہ ایک محاورہ ہے۔اس کا خاص مطلب تو یہ لیا جاتا ہے کہ عورت کسی اور کے بچے کو اپنے شوہر کا بچہ قرار دے دے(کیونکہ بچہ پیٹ میں ہوتا ہے جو ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان ہے)،لیکن عام مفہوم میں اس سے مراد"خود ساختہ جھوٹ گھڑنا اور افترا باندھنا"ہے۔
5. مَعْرُوفٍ(بھلی بات):ہر وہ کام جسے شریعت اور عقلِ سلیم اچھا سمجھے۔اطاعت صرف"جائز"کاموں میں ہے۔
6. كَفَّارَةٌ(کفارہ):چھپانے والا یا مٹانے والا۔یعنی دنیا کی سزا گناہ کے اثر کو مٹا دیتی ہے۔

تشریح:

یہ حدیث"بیعتِ عقبہ اولیٰ"کے موقع پر ہونے والے عہد کی تفصیل بیان کرتی ہے،جو مدینہ ہجرت سے پہلے ہوا۔اس میں اسلامی معاشرے کی اخلاقی بنیادیں رکھی گئیں۔

معاشرتی جرائم کا خاتمہ: اس بیعت میں جن گناہوں(شرک،چوری،زنا،قتلِ اولاد،بہتان)سے روکا گیا،یہ وہ جرائم ہیں جو کسی بھی معاشرے کے امن کو تباہ کردیتے ہیں۔اسلام نے سب سے پہلے ان کی جڑ کاٹی۔

سزا بطور رحمت(کفارہ): اسلام کا تصورِ سزا(Punishment)صرف انتقام نہیں بلکہ"پاکیزگی"ہے۔اگر کسی مسلمان سے چوری یا زنا ہو گیا اور اسلامی عدالت نے اسے شرعی سزا(حد)دے دی،تو یہ اس کے لیے خوشخبری ہے کہ اب آخرت میں اس گناہ پر پوچھ گچھ نہیں ہوگی،وہ دنیا میں ہی پاک ہو گیا۔

اللہ کی مشیت: جس گناہ گار پر اللہ نے دنیا میں پردہ ڈال دیا اور اس کا بھانڈا نہیں پھوٹا،اس کا معاملہ آخرت میں اللہ کی مرضی پر ہے۔یہ"خوارج"کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کرنے والا ضرور جہنم میں جائے گا۔اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ اللہ چاہے تو اسے بھی معاف کرسکتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ ایمان کا تقاضا صرف زبانی دعویٰ نہیں بلکہ اپنے آپ کو ان تمام اخلاقی اور سماجی برائیوں سے پاک رکھنا ہے جو معاشرے کی تباہی کا سبب بنتی ہیں،جیسے شرک،چوری،بدکاری،اپنی اولاد کا قتل اور بہتان تراشی۔یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ایک سچے مومن کا کردار ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے نہ تو اللہ کی توحید میں فرق آئے اور نہ ہی کسی دوسرے انسان کی جان،مال یا عزت کو اس کی زبان یا ہاتھ سے نقصان پہنچے۔یہ بیعت درحقیقت ایک پاکیزہ انسانی معاشرے کی تشکیل کا وہ بنیادی معاہدہ ہے جہاں ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کو پہچانتا ہے۔یہ ہمیں یہ امید بھی دلاتا ہے کہ اگر انسان سے کوئی غلطی ہو جائے اور وہ دنیا میں سزا پالے یا سچی توبہ کرلے،تو اللہ کا فضل اسے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

بہتان تراشی(Social Media Slander): حدیث میں"ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑا ہوا بہتان"آج کل سوشل میڈیا پر بہت عام ہے۔بغیر تحقیق کے کسی کی پگڑی اچھالنا،ایڈیٹ شدہ تصاویر یا جھوٹی خبریں پھیلانا اسی"بہتان"میں آتا ہے۔یہ معاشرے کا ناسور ہے۔

اسقاطِ حمل(Abortion):"اپنی اولاد کو قتل نہ کرو"میں غربت کے ڈر سے اسقاطِ حمل کروانا بھی شامل ہے۔آج کل یہ فیشن بنتا جارہا ہے، حالانکہ یہ زندہ انسان کو مارنے کے مترادف ہے۔

امیر کی اطاعت کی حد: "نیکی (معروف) میں نافرمانی نہ کرو" سے اصول طے ہوا کہ حکمران، باس، یا والدین کی بات تب تک مانی جائے گی جب تک وہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔ اگر وہ گناہ کا حکم دیں تو ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی ("لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق")۔

خلاصہ درس:

شرک، چوری، زنا اور قتلِ اولاد اسلام میں سنگین ترین جرائم ہیں۔

اگر دنیا میں گناہ کی شرعی سزا مل جائے تو آخرت میں دوبارہ سزا نہیں ہوگی۔

جس کے گناہ اللہ نے چھپا لیے، اسے امید رکھنی چاہیے کہ اللہ آخرت میں بھی معاف فرما دے گا۔

درس نمبر: 14۔ حدیث 20، 21

موضوع: انسان کی دو بڑی غلطیاں: قیامت کا انکار اور اللہ کی اولاد ماننا

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «قَالَ اللَّهُ: كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذَلِكَ، وَشَتَمَنِي وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذَلِكَ. أَمَّا تَكْذِيبُهُ إِيَّايَ أَنْ يَقُولَ: إِنِّي لَنْ أُعِيدَهُ كَمَا بَدَأْتُهُ، وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ أَنْ يَقُولَ: اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا، وَأَنَا الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لِي كُفُوًا أَحَدٌ».

وَفِي رِوَايَةٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: «وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ: لِي وَلَدٌ، وَسُبْحَانِي أَنْ أَتَّخِذَ صَاحِبَةً أَوْ وَلَدًا». (رواه البخاري)

اردو ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابن آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ اسے ایسا کرنے کا کوئی حق نہ تھا، اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ اسے ایسا کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔

اس کا مجھے جھٹلانا یہ کہنا ہے کہ 'میں اسے ہرگز دوبارہ (زندہ کر کے) نہیں لوٹاؤں گا جیسا کہ میں نے اسے پہلی بار پیدا کیا تھا۔' (حالانکہ دوبارہ بنانا پہلی بار بنانے سے آسان ہے)۔

اور اس کا مجھے گالی دینا یہ کہنا ہے کہ 'اللہ نے (کسی کو) اپنا بیٹا بنا لیا ہے'، حالانکہ میں 'صمد' (بے نیاز) ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا اور نہ میں جنا گیا، اور کوئی میرا ہمسر (برابر) نہیں۔"

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ الفاظ ہیں): "اور اس کا مجھے گالی دینا اس کا یہ کہنا ہے کہ میری اولاد ہے، حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ میں کوئی بیوی یا بیٹا رکھوں۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. حَدِيثٌ قُدْسِيٌّ (حدیث قدسی): یہ وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا کلام اپنے الفاظ میں بیان فرمائیں۔
2. كَذَّبَنِي (مجھے جھٹلایا): یعنی میری قدرت کا انکار کیا۔ جب انسان کہتا ہے کہ اللہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا تو وہ درحقیقت اللہ کو "عاجز" اور "جھوٹا" کہہ رہا ہوتا ہے۔
3. شَتَمَنِي (مجھے گالی دی): "شتم" کا مطلب ہے کسی میں عیب نکالنا یا برا بھلا کہنا۔ اللہ کے لیے اولاد ثابت کرنا اس لیے گالی ہے کیونکہ اولاد کی ضرورت اسے ہوتی ہے جو کمزور ہو، بوڑھا ہو یا جسے نسل چلانے کی حاجت ہو۔ اللہ ان تمام بشری کمزوریوں سے پاک ہے، لہٰذا اسے باپ کہنا اس کی شان گھٹانا ہے۔

4. الصَّمَدُ (بے نیاز): وہ سردار جس کی طرف سب اپنی حاجتیں لے کر جائیں لیکن وہ کسی کا محتاج نہ ہو، نہ وہ کھاتا پیتا ہو اور نہ اس کے اندر کوئی خلا ہو۔
5. صَاحِبَةً (بیوی/رفیقہ): اولاد کے لیے بیوی کا ہونا ضروری ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت نے وضاحت کر دی کہ جب بیوی ہی نہیں تو بچہ کہاں سے ہوگا؟

تشریح:

اس حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی ناشکری اور جہالت پر سخت شکوہ فرمایا ہے۔ انسان دو بڑے عقلی اور نظریاتی جرائم کا مرتکب ہوتا ہے:

قیامت کا انکار (اللہ کی قدرت کو چیلنج): انسان سمجھتا ہے کہ جب وہ مر کر مٹی ہو جائے گا تو دوبارہ کیسے زندہ ہوگا؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ سوچنا میری قدرت کی توہین ہے۔ جب میں نے تمہیں "کچھ نہیں" (Zero) سے پیدا کر دیا، تو اب جب تمہارا مادہ (Matter) موجود ہے تو تمہیں دوبارہ جوڑنا میرے لیے کیا مشکل ہے؟ عقلی طور پر "اعادہ" (Repeat کرنا) "ایجاد" (First Creation) سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

اولاد کا عقیدہ (اللہ کی ذات میں عیب): عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو، یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کو اور مشرکینِ مکہ نے فرشتوں کو اللہ کی اولاد کہا۔ اللہ نے اسے "گالی" (Abuse) قرار دیا۔ کیونکہ باپ بننا مخلوق کی صفت ہے، خالق کی نہیں۔ اللہ "لم یلد ولم یولد" ہے (نہ اس نے کسی کو جنا، نہ وہ کسی سے جنا گیا)۔ وہ اکیلا ہے، اسے سہارے یا وارث کی ضرورت نہیں۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو جھٹلانا اور اس کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کرنا انسان کی سب سے بڑی بدبختی اور سنگین گناہ ہے۔ دوبارہ زندہ کیے جانے کا انکار کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدرت کو جھٹلانے کے مترادف ہے، حالانکہ جس رب نے انسان کو پہلی بار عدم سے پیدا کیا اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرنا اسے گالی دینے کے برابر ہے کیونکہ وہ واحد، بے نیاز اور پاک ذات ہے جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور کائنات کی کوئی چیز اس کی ہمسر نہیں ہو سکتی۔ یہ پیراگراف ہمیں اپنے عقیدے کو ہر قسم کے باطل خیالات سے پاک رکھنے اور اللہ کی توحید و عظمت پر کامل یقین رکھنے کی عملی ترغیب دیتا ہے تاکہ ہمارا ایمان سلامت رہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

الحاد اور مادہ پرستی (Atheism): آج کل کے ملحدین (Atheists) کہتے ہیں کہ "مرنے کے بعد زندگی کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں۔" یہ وہی پرانا اعتراض ہے جسے حدیث میں "تکذیب" (جھٹلانا) کہا گیا ہے۔ مسلمان کا ایمان ہے کہ جو خدا بگ بینگ (Big Bang) کر سکتا ہے، وہ بگ کرنچ (Big Crunch) کے بعد دوبارہ زندگی بھی دے سکتا ہے۔

بگ کرنچ کیا ہے؟

بگ کرنچ (Big Crunch) ایک سائنسی نظریہ (Theory) ہے جو کائنات کے انجام کے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب ہے "عظیم سمٹاؤ" یا "بہت بڑا سکڑنا"۔ اسے آسان الفاظ میں یوں سمجھیں:

سائنسدان کہتے ہیں کہ کائنات ایک بہت بڑے دھماکے (Big Bang) سے وجود میں آئی اور تب سے یہ مسلسل پھیل رہی ہے (جیسے ایک غبارے میں ہوا بھری جائے تو وہ پھیلتا ہے)۔

اسی طرح سائنسدانوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب کائنات کا یہ پھیلنا رک جائے گا اور کششِ ثقل (Gravity) کی وجہ سے کائنات واپس سکڑنا شروع ہو جائے گی۔ ستارے، کہکشائیں اور سیارے سب ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔ بالآخر ساری کائنات سکڑ کر واپس

ایک چھوٹے سے نقطے (Point) میں ختم ہو جائے گی، بالکل اسی طرح جیسے یہ شروع ہوئی تھی۔ اسی عمل کو "Big Crunch" کہتے ہیں۔
قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا نقشہ کچھ اسی طرح کھینچا ہے:

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ

"جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ لیں گے جیسے خطوں کا طومار لپیٹ لیا جاتا ہے۔ جس طرح ہم نے پہلی بار پیدائش کی ابتدا کی تھی، اسی طرح ہم اسے دوبارہ پیدا کریں گے۔" (سورۃ الانبیاء: 104)

بگ کرنچ کا نظریہ دراصل منکرینِ قیامت کے لیے ایک علمی جواب ہے کہ اگر سائنس یہ مان سکتی ہے کہ کائنات سکڑ کر واپس اپنی ابتدائی حالت میں جا سکتی ہے، تو پھر اللہ کے لیے انسان کو مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ یہ وہی "اعادہ" (Repetition) ہے۔

مذہبی رواداری کی حدود: ہمیں عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے، لیکن عقیدے کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں۔ ہم "خدا کا بیٹا" (Son of God) کی اصطلاح کو تعظیماً بھی استعمال نہیں کر سکتے، کیونکہ اللہ کے نزدیک یہ کفر ہی نہیں، بلکہ "گالی" ہے۔

توحید کی حساسیت: اللہ تعالیٰ شرک کے معاملے میں بہت غیور (غیرت والا) ہے۔ وہ اپنی خدائی میں کسی کی شراکت برداشت نہیں کرتا۔ ہمیں اپنی گفتگو میں محتاط رہنا چاہیے کہ کہیں نادانی میں اللہ کی شان میں گستاخی نہ کر بیٹھیں۔

خلاصہ درس:

قیامت اور دوبارہ زندگی کا انکار کرنا دراصل اللہ کی قدرت کو جھٹلانا ہے۔
اللہ کے لیے بیٹا، بیٹی یا بیوی ثابت کرنا اللہ کو گالی دینے کے مترادف ہے۔
اللہ "صمد" ہے، وہ خاندانی نظام اور رشتوں ناتوں کی ضرورتوں سے پاک اور بلند ہے۔

درس نمبر: 15۔ حدیث نمبر: 25

موضوع: اخلاصِ دل سے شہادتِ توحید کی فضیلت اور عمل کی اہمیت

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمُعَاذٌ رديفه على الرحل قَالَ: «يَا مُعَاذ بن جبل قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ ثَلَاثًا قَالَ مَا مِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللَّهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَلَا أُخْبِرُ بِهِ النَّاس فيستبشروا قَالَ إِذا يتكلوا وَأَخْبر بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّمًا». (متفق عليه)

اردو ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سواری پر تشریف فرما تھے اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اے معاذ بن جبل!" انہوں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ وسعدیک" (میں حاضر ہوں اے اللہ کے رسول اور آپ کی فرمانبرداری کے لیے تیار ہوں)۔ آپ ﷺ نے دوبارہ پکارا: "اے معاذ!" انہوں نے پھر وہی عرض کیا۔ یہ سلسلہ تین بار ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص بھی سچے دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اللہ اس پر آگ (دوزخ) کو حرام کر دیتا ہے"۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! کیا میں لوگوں کو اس کی خبر نہ دے دوں تاکہ وہ خوش ہو جائیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "تب تو وہ (صرف) اسی پر بھروسہ کر لیں گے (اور عمل چھوڑ دیں گے)"۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی موت کے وقت یہ حدیث اس ڈر سے بیان کر دی کہ کہیں (علم چھپانے کا) گناہ نہ ہو۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1. لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ: یہ عربی کا ایک بلیغ جملہ ہے جو انتہائی ادب اور مکمل سپردگی کے لیے بولا جاتا ہے۔ "لبیک" کا مطلب ہے میں بار بار حاضر ہوں، اور "سعدیک" کا مطلب ہے میں آپ کی فرمانبرداری میں سعادت محسوس کرتا ہوں۔
2. صِدْقًا مِّنْ قَلْبِہٖ: یعنی گواہی صرف زبان سے نہ ہو بلکہ دل اس کی تصدیق کرے۔ اس میں اخلاص شرط ہے۔
3. اِذًا یَّتَّکِلُوْا: اس کا مادہ 'وکل' ہے، یعنی بھروسہ کر لینا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ لوگ اعمالِ صالحہ چھوڑ کر صرف کلمہ پر تکیہ کر لیں گے۔
4. تَاَثُّمًا: گناہ سے بچنے کے لیے۔ یعنی علم کو چھپانے کے گناہ سے بچنے کے لیے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آخر میں یہ حدیث بیان فرمائی۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں ایمان کی اصل روح یعنی "اخلاص" کو بیان کیا گیا ہے۔

توجہ دلانے کا نبوی انداز: آپ ﷺ نے حضرت معاذ کو تین بار پکارا تاکہ ان کی مکمل توجہ حاصل ہو جائے اور بات کی اہمیت ذہن نشین ہو جائے۔

اخلاص کی شرط: نجات کا مدار صرف زبان سے کلمہ پڑھنے پر نہیں بلکہ دل کی سچائی پر ہے۔ علمائے کے نزدیک ایمان میں دل کی تصدیق اور زبان کا اقرار دونوں شامل ہیں، لیکن نجاتِ اخروی کے لیے اخلاص شرطِ اول ہے۔

خوف اور امید کا توازن: آپ ﷺ نے اس خوشخبری کو عام کرنے سے اس لیے روکا کیونکہ عام لوگ رحمت کی امید میں فرائض اور اعمال (جیسے نماز، روزہ) میں سستی کر سکتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین میں رحمت کی امید کے ساتھ ساتھ عذاب کا خوف بھی ضروری ہے تاکہ انسان عمل سے غافل نہ ہو۔

کلمہ گو کا انجام: موحد (توحید پر قائم رہنے والا) اگر گناہگار بھی ہو تو وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد یا اللہ کی رحمت سے بالآخر جنت میں داخل ہو جائے گا۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ کلمہ توحید اور رسالت کی سچی گواہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا وہ عظیم ذریعہ ہے جو انسان کے لیے جہنم کی آگ کو حرام کر دیتا ہے۔ یہ ہمیں دل کے اخلاص اور نیت کی سچائی کی اہمیت سے آگاہ کرتی ہے کہ ایمان محض زبان سے چند الفاظ کہنے کا نام نہیں بلکہ یہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی سچائی کو تسلیم کرنے کا نام ہے۔ نبی کریم ﷺ کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ خوشخبری عام کرنے سے عارضی طور پر روکنا اس نبوی حکمت کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو صرف امید کے سہارے بیٹھ کر نیک اعمال سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہمیں فکر عطا کرتا ہے کہ ہم اپنے ایمان کی بنیاد کو اتنا مضبوط کریں کہ خاتمہ بالخیر نصیب ہو اور ہم جہنم سے دائمی نجات پا سکیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

1. **عملی سستی اور خوش فہمی:** آج کل بہت سے مسلمان صرف "نام کے مسلمان" ہونے یا "کلمہ پڑھنے" کو کافی سمجھ کر نماز اور دیگر شرعی احکامات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ کلمہ نجات کی کنجی تو ہے، لیکن اس کنجی کے دندانے "اعمالِ صالحہ" ہیں، جن کے بغیر جنت کا دروازہ کھلنا مشکل ہے۔
2. **علم کی امانت:** حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا آخری وقت میں حدیث بیان کرنا ہمیں سکھاتا ہے کہ دینی علم کو لوگوں تک پہنچانا امانت ہے، اسے اپنی ذات تک محدود رکھنا گناہ کا باعث بن سکتا ہے، بشرطیکہ فتنہ کا ڈر نہ ہو۔
3. **استاد اور شاگرد کا تعلق:** نبی کریم ﷺ کا اپنے صحابی کو اپنے پیچھے بٹھانا ان کی کمالِ عاجزی اور اپنے شاگرد کے لیے محبت کی علامت ہے۔ آج کے مبلغین کو بھی اپنے مخاطبین کے ساتھ اسی شفقت اور بے تکلفی کا رویہ اپنانا چاہیے تاکہ بات اثر کرے۔

خلاصہ درس:

- سچے دل سے کلمہ پڑھنا جہنم سے دائمی نجات کی ضمانت ہے۔
- ایمان کا کمال اخلاص میں ہے، محض زبانی دعویٰ معتبر نہیں۔
- مومن کو اللہ کی رحمت سے پرامید بھی ہونا چاہیے اور اپنے اعمال کی فکر بھی کرنی چاہیے۔

درس نمبر:16۔حدیث نمبر:29

موضوع: جنت میں لے جانے والے اعمال اور زبان کی حفاظت

عَن معَاذ بن جبل قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَخبِرْنِي بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدنِي عَن النَّار قَالَ: «لَقَد سَأَلتنِي عَن عَظِيمٍ وَإِنَّهُ لِيَسِيرٌ عَلَى مَنْ يَسَّرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ: تَعْبُدُ اللَّهَ وَلَا تُشرِكُ بِهِ شَيْئًا وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ» ثُمَّ قَالَ: «أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى أَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ الصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيئَةُ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلَاةُ الرَّجُلِ من جَوف اللَّيْلِ» ثُمَّ قَالَ: «أَلَا أَدُلُّكَ بِرَأْسِ الْأَمر كُله وَعَمُودِهِ وَذِرْوَةِ سَنَامِهِ؟» قُلْتُ: بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: «رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعَمُودُهُ الصَّلَاةُ، وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ» ثُمَّ قَالَ: «أَلَا أُخبِرُكَ بِمِلَاكِ ذَلِكَ كُلِّهِ؟» قُلْتُ: بَلَى يَا نَبِيَّ اللَّهِ، فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ فَقَالَ: «كُفَّ عَلَيْكَ هَذَا» فَقُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللَّهِ، وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُونَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهِ؟ فَقَالَ: «ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا مُعَاذُ، وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ؟» (رواه احمد و الترمذی و ابن ماجه)

اردو ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں داخل کردے اور آگ سے دور کردے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "تم نے ایک بڑے معاملے کے بارے میں سوال کیا ہے، اور بے شک یہ اس شخص کے لیے آسان ہے جس کے لیے اللہ اسے آسان کردے: اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا میں تمہیں بھلائی کے دروازوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ روزہ ڈھال ہے، اور صدقہ گناہوں کو ایسے بجھا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو، اور آدھی رات کے وقت آدمی کا نماز پڑھنا۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا میں تمہیں تمام معاملات کی اصل، اس کے ستون اور اس کی چوٹی کے بارے میں نہ بتاؤں؟" میں نے عرض کیا: "کیوں نہیں اے اللہ کے رسول!" آپ ﷺ نے فرمایا: "معاملے کی اصل اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا میں تمہیں ان سب کی جڑ نہ بتادوں؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں اے اللہ کے نبی!" تو آپ ﷺ نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا: "اسے قابو میں رکھو۔" میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے نبی! کیا ہم جو باتیں کرتے ہیں ان پر بھی ہماری پکڑ ہوگی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "معاذ! لوگ دوزخ میں اپنی زبانوں کی کاٹی ہوئی کھیتیوں (ناپسندیدہ باتوں) کی وجہ سے ہی اوندھے منہ گرائے جائیں گے۔" [18،156]

لغوی و علمی تحقیق:

1. عَظِیم: اس سے مراد بہت بڑی اور اہم بات ہے، کیونکہ جنت کا حصول اور دوزخ سے نجات انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔
2. جُنَّۃٌ: اس کا معنی ڈھال ہے؛ یعنی روزہ انسان کو گناہوں اور جہنم کی آگ سے بچانے والی ڈھال ہے۔
3. ذِرْوَۃِ سَنَامِہٖ: اونٹ کے کوہان کا سب سے بلند حصہ؛ یہاں دین کے بلند ترین مقام یعنی جہاد کے لیے استعارہ استعمال ہوا ہے [18،156]۔
4. مِلَاکِ: کسی چیز کی جڑ، بنیاد یا وہ حصہ جس پر پوری چیز کا دار و مدار ہو۔

5. حَصَائِدُ: کھیتی کی کٹائی؛ مراد وہ گناہ ہیں جو انسان اپنی زبان سے بول کر کماتا ہے۔

تشریح:

اس حدیث میں دین کا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے:

بنیادی ارکان: نجات کی پہلی شرط توحید اور ارکانِ اسلام کی پابندی ہے، لیکن یہ اعمال صرف اسی کے لیے آسان ہوتے ہیں جسے اللہ کی توفیق نصیب ہو۔

دین کی ساخت: اسلام کو ایک جسم یا عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا سر "اسلام" (تسلیم و رضا)، ستون "نماز" اور بلند ترین مقام "جہاد" ہے۔ بغیر ستون کے عمارت قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح بغیر نماز کے دین بے شکل ہے۔

زبان کی اہمیت: آپ ﷺ نے تمام عبادات کے باوجود زبان کی حفاظت کو ان سب کی "جڑ" قرار دیا۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر زبان قابو میں نہ ہو تو وہ تمام نیک اعمال کو ضائع کر سکتی ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ جنت کے حصول کا راستہ نہایت واضح اور جامع ہے، جس کا آغاز توحید اور ارکانِ اسلام کی عملی پابندی سے ہوتا ہے۔ یہ حدیث ہمیں دین کے کامل ڈھانچے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے، جہاں اسلام اس کا سر ہے، نماز اس کا مضبوط ستون ہے اور اللہ کی راہ میں جدوجہد (جہاد) اس کی بلندی ہے۔ اس کا سب سے اہم اور لرزہ خیز سبق یہ ہے کہ ایک انسان کی تمام تر عبادات، روزے اور صدقات اس وقت تک اسے جہنم سے نہیں بچا سکتے جب تک وہ اپنی زبان پر قابو نہ پالے۔ یہ ہمیں اس کڑوی حقیقت سے باخبر کرتی ہے کہ زبان کی ایک بے احتیاطی انسان کو اوندھے منہ آگ میں گرا سکتی ہے، لہٰذا ہمیں اپنی گفتگو کو اللہ کی رضا کے تابع کرنا چاہیے تاکہ ہماری محنت ضائع نہ ہو۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

1. **زبان کا جدید استعمال (سوشل میڈیا):** آج کے دور میں "حصائد السنتھم" (زبان کی کاٹ) صرف بولنے تک محدود نہیں، بلکہ سوشل میڈیا پر کی جانے والی کمنٹس، غیبت، بہتان تراشی اور ٹرولنگ بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ ایک غلط پوسٹ یا کمنٹ انسان کو جہنم کے گڑھے میں گرا سکتی ہے۔

2. **عبادات اور اخلاقیات کا توازن:** لوگ نماز اور روزے کی پابندی تو کرتے ہیں لیکن اخلاقیات، خاص طور پر زبان کے استعمال (گالی گلوچ، جھوٹ) میں احتیاط نہیں کرتے۔ یہ حدیث سکھاتی ہے کہ زبان پر قابو پائے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔

3. توفیقِ الٰہی کی طلب: نیکی کی راہ پر چلنا اللہ کے فضل کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمیں ہمیشہ اللہ سے ہدایت اور اعمالِ صالحہ کی آسانی کی دعا مانگنی چاہیے۔

خلاصہ درس:

- جنت کا راستہ ایمان، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج سے گزرتا ہے۔
- نفلی عبادات (تہجد) اور صدقہ گناہوں کے اثرات کو ختم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔
- نماز دین کا وہ ستون ہے جس پر پوری عمارت کھڑی ہے۔
- تمام نیک اعمال کی کامیابی کا انحصار زبان کی حفاظت پر ہے؛ کم بولنا اور سوچ سمجھ کر بولنا ہی نجات کا راستہ ہے۔

درس نمبر: 17۔ حدیث نمبر: 30، 31

موضوع: ایمان کی تکمیل کا معیار: حبِ الٰہی اور بغضِ الٰہی

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ وَأَعْطَى لِلَّهِ وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ». (رواه أبو داود) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ مُعَاذِ بْنِ أَنَسٍ مَعَ تَقْدِيمٍ وَتَأْخِيرٍ وَفِيهِ: «فقد استكمل إيمانه».

اردو ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے اللہ ہی کے لیے محبت کی، اللہ ہی کے لیے دشمنی کی، اللہ ہی کے لیے (مال) دیا اور اللہ ہی کے لیے (مال) روک لیا، تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا"۔ امام ترمذی نے یہی حدیث حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے جس کے آخر میں ہے کہ "یقیناً اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. اِسْتَکْمَلَ: اس کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کے تمام لوازمات اور شرائط کے ساتھ پورا کرنا۔ یہاں مراد ایمان کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جہاں انسان کی خواہشات اللہ کے تابع ہو جائیں۔
2. اَبْغَضَ: بغض یا ناپسندیدگی۔ اس سے مراد کسی کی ذات سے دشمنی نہیں بلکہ اس کے برے اعمال یا اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے اس سے دوری اختیار کرنا ہے۔
3. اَعْطٰی وَمَنَعَ: دینا اور روکنا۔ اس میں مالی صدقات، مدد اور وقت کی قربانی سب شامل ہیں۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں ایمان کی روح کو بیان فرمایا ہے:

1. اخلاصِ نیت: ایمان صرف چند ظاہری اعمال کا مجموعہ نہیں بلکہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جہاں انسان کے تمام تعلقات اور معاملات کا مرکز صرف اللہ کی رضا بن جائے۔

2. محبت اور بیزاری کا توازن: محدثین فرماتے ہیں کہ ایک مومن کی پسند اور ناپسند اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ دین کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ وہ نیک لوگوں سے ان کی نیکی کی وجہ سے محبت کرتا ہے اور نافرمانوں سے ان کی نافرمانی کی بنا پر بیزار رہتا ہے۔

3. ایمان کا کمال: جب انسان کے جذبات (محبت و نفرت) اور اس کے افعال (دینا اور روکنا) اللہ کے حکم کے تابع ہو جائیں، تو اس کا ایمان کمال کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ ایمان کی تکمیل محض ظاہری عبادات میں نہیں، بلکہ اپنے قلبی جذبات اور سماجی معاملات کو اللہ کی رضا کے تابع کرنے میں پوشیدہ ہے۔ جب انسان کی محبت، دشمنی، کسی کو دینا اور نہ دینا صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو جائے، تو اس کا ایمان کامل ہو جاتا ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہمیں اپنی ذاتی انا اور پسند و ناپسند کے بجائے اللہ کے احکامات کو ہر چیز پر فوقیت دینی چاہیے، کیونکہ اخلاصِ نیت ہی وہ بنیاد ہے جس پر ہمارے ایمان کی عمارت کھڑی ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

1. گروہ بندی اور تعصب: آج کل ہماری محبتیں اور دشمنیاں اکثر سیاسی جماعتوں، برادریوں یا ذاتی مفادات کے گرد گھومتی ہیں۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ اگر کسی سے تعلق رکھنا ہے یا ختم کرنا ہے تو اس کا معیار صرف اللہ کی رضا ہونی چاہیے۔

2. دکھاوے کی سخاوت: سوشل میڈیا کے اس دور میں لوگ داد پانے کے لیے خیرات کرتے ہیں۔ حدیث ہمیں یاد دلاتی ہے کہ "دینا" تب ہی ایمان کی تکمیل ہے جب وہ صرف اللہ کے لیے ہو، نہ کہ شہرت کے لیے۔

3. سوشل بائیکاٹ اور تعلقات: کسی سے ناراضگی کی صورت میں ہم شریعت کے حدود بھول جاتے ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر کسی برائی کی وجہ سے کسی سے دوری اختیار کرنی ہو تو وہ بھی دین کی اصلاح کی نیت سے ہونی چاہیے، نہ کہ کینہ و پرخاش کی بنا پر۔

خلاصہ درس:

1. ایمان کی تکمیل کا مدار نیتوں کے پاک ہونے اور اللہ کی رضا پر ہے۔
2. اپنے تمام لین دین اور دوستی دشمنی کے معیار کو اللہ کے احکامات کے مطابق ڈھالیں۔
3. جس شخص کی زندگی کا مقصد صرف اللہ کو راضی کرنا بن جائے، اسے ایمان کی مٹھاس نصیب ہوتی ہے۔

درس نمبر:18۔حدیث نمبر:33،34

موضوع: کامل مسلمان، مومن، مجاہد اور مہاجر کی پہچان

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلَى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ». (رواه الترمذي والنسائي) وَزَادَ الْبَيْهَقِيُّ فِي «شُعَبِ الْإِيمَانِ» بِرِوَايَةِ فَضَالَةَ: «وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللَّهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوبَ».

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مسلمان (کامل) وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں اور اپنے مالوں کے بارے میں پرامن رہیں۔" اور امام بیہقی نے حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ اضافہ کیا ہے: "اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی فرمانبرداری میں اپنے نفس سے جہاد کرے، اور مہاجر وہ ہے جو خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑ دے۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. **المُؤمِنُ**: یہ 'امن' سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے دوسروں کو امن اور سلامتی فراہم کرنا، یعنی وہ شخص جس کے کردار سے دوسرے خود کو محفوظ سمجھیں۔
2. **المجاهِدُ**: جہد سے نکلا ہے، جس کے معنی کوشش کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اللہ کی رضا کے لیے اپنے اندر کی برائیوں سے لڑنا ہے۔
3. **المُهَاجِرُ**: ہجرت سے ہے، جس کا مطلب گناہوں کی آلودگی کو چھوڑ کر نیکی کی طرف کوچ کرنا ہے۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں حضور ﷺ نے دینداری کی عملی روح کو چار پہلوؤں سے واضح فرمایا ہے:

1. معاشرتی امن: محدثین فرماتے ہیں کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد آپ کی طرف سے بے خوف ہو جائے؛ نہ اسے اپنی جان کا خطرہ ہو اور نہ مال کا۔

2. اخلاقی سلامتی: مسلمان صرف نماز روزے کا نام نہیں بلکہ اپنی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو دکھ نہ پہنچانا اسلام کی بنیادی شرط ہے۔

3. جہادِ نفس: علماء کے نزدیک دشمن سے لڑنے سے پہلے اپنے نفس کی خواہشات کو اللہ کے تابع کرنا "جہادِ اکبر" ہے۔

4. حقیقی ہجرت: گناہوں کو چھوڑ دینا ہی ہجرت ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت کرنی چاہیے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اسلام اور ایمان کا اصل تقاضا دوسروں کے حقوق کی حفاظت اور اپنے نفس کی مسلسل اصلاح ہے۔ ایک سچا مسلمان اور مومن وہی ہے جس کے رویے سے دوسرے انسان خود کو محفوظ محسوس کریں اور جس پر لوگوں کا جان و مال کے حوالے سے

کامل بھروسہ ہو۔ یہ حدیث ہمیں یہ بصیرت بھی عطا کرتی ہے کہ حقیقی جہاد اپنے نفس کی ناجائز خواہشات کے خلاف لڑنا ہے اور اصل ہجرت اللہ کی نافرمانیوں اور گناہوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا نام ہے۔ یہ پیراگراف ہمیں ایک ذمہ دار اور پرامن معاشرے کا فرد بننے کی ترغیب دیتا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

1. کاروباری اعتماد: آج کے دور میں مومن کی صفت 'امانت داری' مفقود ہوتی جارہی ہے۔ اگر ہم لوگوں کے مال (رشوت، غبن) اور جان کے لیے خطرہ بن جائیں تو ہمارا ایمان ناقص ہے۔

2. سوشل میڈیا کا جہاد: اپنی زبان اور تحریر (کی بورڈ) سے دوسروں کی تذلیل سے بچنا آج کے دور کا سب سے بڑا 'اسلام' ہے۔

3. نفس پر قابو: موجودہ پرفتن دور میں گناہوں کی کثرت کے باوجود اللہ کی اطاعت پر قائم رہنا ہی وہ اصل جہاد ہے جس کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے۔

خلاصہ درس:

1. کامل مومن وہ ہے جس کا کردار لوگوں کے لیے باعثِ امن ہو۔
2. نیکی کی راہ میں اپنے نفس کی بری خواہشات کو کچلنا ہی اصل بہادری اور جہاد ہے۔
3. ہر اس گناہ کو چھوڑ دینا جس سے اللہ نے منع کیا ہے، بہترین ہجرت ہے۔

درس نمبر: 19۔ حدیث نمبر: 35

موضوع: امانت داری اور ایفائے عہد کی اہمیت

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا قَالَ: «لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ» . (رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ)

اردو ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں شاذ و نادر ہی کوئی خطبہ دیا ہوگا جس میں یہ نہ فرمایا ہو: "اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں، اور اس کا کوئی دین نہیں جس میں عہد (وعدے) کی پابندی نہیں"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. قَلَّمَا: اس کا مطلب ہے "بہت کم" یا "شاذ و نادر"۔ یعنی آپ ﷺ اس بات کی اہمیت کی وجہ سے اسے تقریباً ہر خطبے میں دہراتے تھے۔
2. أَمَانَة: امانت داری۔ اس سے مراد صرف مالی امانت نہیں بلکہ ہر وہ ذمہ داری اور راز ہے جو انسان کے سپرد کیا جائے۔
3. عَهْد: عہد یا معاہدہ۔ اس میں اللہ سے کیا ہوا عہدِ بندگی اور انسانوں کے آپس کے وعدے دونوں شامل ہیں۔

تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں علماء نے درج ذیل نکات بیان فرمائے ہیں:

1. ایمان کا جوہر: محدثین فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا اسے ہر خطبے میں دہرانا اس بات کی دلیل ہے کہ امانت داری ایمان کی روح ہے۔ جس شخص کے معاملات پاک صاف نہیں، اس کا ایمان ناقص ہے۔

2. دین کی بنیاد: دین صرف عبادات کا نام نہیں بلکہ معاملات کی پختگی بھی دین کا حصہ ہے۔ جو شخص وعدہ خلافی کرتا ہے، اس کے دین میں ایسی کمی ہے جو اسے کمال تک پہنچنے سے روکتی ہے۔

3. محرومی: علماء کے نزدیک ان صفات سے محروم شخص اگرچہ دائرہ اسلام سے باہر نہیں ہوتا، لیکن وہ ایمان کی حقیقی مٹھاس اور حلاوت سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ امانت داری اور عہد کی پابندی ایمان اور دین کی ایسی بنیادی جڑیں ہیں جن کے بغیر بندگی کا دعویٰ کھوکھلا رہ جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا تقریباً ہر خطبے میں اس بات کو دہرانا اس کی غیر معمولی اہمیت کی دلیل ہے، جو ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ ایک سچا مومن وہی ہے جس پر لوگ آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکیں اور جس کا قول و فعل تضاد سے پاک ہو۔ یہ حدیث ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ جو شخص امانت میں خیانت کرتا ہے یا اپنے کیے ہوئے وعدوں کو آسانی سے توڑ دیتا ہے، وہ نہ صرف اخلاقی طور پر گرا ہوا ہے بلکہ اس کا ایمان کمال کے درجے سے محروم ہے اور وہ دین کی اصل روح سے دور ہو چکا ہے۔ یہ پیرا گراف ہمیں اپنے معاملات میں شفافیت پیدا کرنے اور معاشرے کے لیے ایک قابلِ اعتماد فرد بننے کی بھرپور ترغیب دیتا ہے کیونکہ ایمان کی مٹھاس صرف انہی کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ اور اس کی مخلوق کے ساتھ اپنے عہد میں سچے ہوتے ہیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

1. دفتری اور سرکاری امانت: آج کل ملازمت میں وقت کی پابندی نہ کرنا یا سرکاری وسائل کا ذاتی استعمال کرنا امانت میں خیانت تصور کیا جاتا ہے۔ یہ حدیث ہمیں ہر ذمہ داری کو اللہ کی دی ہوئی امانت سمجھ کر پورا کرنے کی تلقین کرتی ہے۔

2. کاروباری معاہدے: موجودہ دور میں سودے بازی اور لین دین میں وعدہ خلافی کو "ہوشیاری" سمجھا جاتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ مسلمان کی پہچان اس کی زبان ہے؛ چاہے تحریری معاہدہ ہو یا زبانی، اس کی پابندی لازم ہے۔

3. رازوں کی حفاظت: کسی کی نجی بات یا کسی کے عیب کا پتہ چل جانا بھی ایک امانت ہے۔ سوشل میڈیا پر دوسروں کی نجی زندگی یا رازوں کو فاش کرنا اس حدیث کی رو سے سخت ناپسندیدہ ہے۔

خلاصہ درس:

1. کامل ایمان کے لیے امانت داری ایک لازمی شرط ہے۔
2. جو شخص وعدوں کی پاسداری نہیں کرتا، اس کی دینداری ادھوری ہے۔
3. ایک مسلمان کو اپنے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں قابلِ بھروسہ ہونا چاہیے۔

درس نمبر:20۔ حدیث نمبر:42

موضوع: اسلام کی عالمگیر اشاعت اور غلبہ کی پیشگوئی

عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْأَسْوَدِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللَّهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيزٍ أَوْ ذُلِّ ذَلِيلٍ إِمَّا يُعِزُّهُمُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِينُونَ لَهَا». (رواہ احمد)

اردو ترجمہ: حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "زمین کی پیٹھ پر مٹی کا کوئی گھر (پکا مکان) اور نہ ہی اون کا کوئی خیمہ (کچا مکان) ایسا باقی رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کا کلمہ داخل نہ فرما دے؛ عزت والے کو عزت دے کر یا ذلیل ہونے والے کو ذلت دے کر۔ یا تو اللہ انہیں عزت دے گا اور انہیں اسلام والوں میں شامل کر دے گا، یا انہیں ذلیل کرے گا تو وہ اسلام (کی حکومت اور حکم) کے تابع ہو جائیں گے"۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1. مَدَرٍ: اس سے مراد مٹی یا گارے سے بنے ہوئے پکے مکانات ہیں جو عموماً شہروں اور بستیوں میں ہوتے ہیں۔
2. وَبَرٍ: اونٹ کے بال یا اون، جس سے خانہ بدوش لوگ صحراؤں میں خیمے بناتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ شہر ہوں یا دور دراز کے دیہات، اسلام ہر جگہ پہنچے گا۔
3. بِعِزِّ عَزِيزٍ أَوْ ذُلِّ ذَلِيلٍ: علماء فرماتے ہیں کہ عزت سے مراد یہ ہے کہ لوگ برضا و رغبت اسلام قبول کر کے معزز بن جائیں گے، اور ذلت سے مراد یہ ہے کہ جو کفر پر اڑے رہیں گے وہ اسلامی ریاست کے ماتحت (جزیہ دے کر) رہنے پر مجبور ہوں گے۔
4. يَدِينُونَ: اس کا مطلب ہے فرمانبردار ہونا یا تابع ہو جانا۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں حضور ﷺ نے ایک عظیم الشان پیشگوئی فرمائی ہے:

1. اسلام کی عالمگیریت: محدثین کے نزدیک یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کسی خاص علاقے یا قوم کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہے اور اس کا پیغام دنیا کے چپے چپے تک پہنچ کر رہے گا۔

2. کلمہ حق کا داخلہ: کلمہ اسلام کے گھر میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت کا چرچا ہر جگہ ہو گا، چاہے لوگ اسے مان کر معزز بنیں یا نہ مان کر مغلوب رہیں۔

3. حق کا غلبہ: علماء فرماتے ہیں کہ یہ پیشگوئی صحابہ کرام کے دور میں بڑی حد تک پوری ہوئی جب قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں زیر ہوئیں، اور قیامت تک مختلف صورتوں میں اس کا ظہور ہوتا رہے گا یہاں تک کہ دینِ الٰہی مکمل غالب آ جائے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اسلام ایک عالمگیر اور غالب آنے والا دین ہے جس کا پیغام کائنات کے ہر گوشے تک پہنچنا مکتوب ہے۔ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اسلام کی حقانیت پر کامل یقین فراہم کرتی ہے کہ مادی وسائل چاہے کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں، اللہ کا کلمہ ہر کچے پکے مکان اور ہر صحرائی خیمے تک پہنچ کر رہے گا۔ یہ ہمیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتی ہے کہ حقیقی عزت صرف اسلام کی سچی اتباع میں ہے اور جو لوگ اس سے اعراض کریں گے، وہ معنوی یا مادی طور پر ذلت و رسوائی کا شکار ہوں گے۔ یہ پیراگراف ہمیں دعوتِ دین کے کام میں پرامید رہنے اور اس عظیم پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی ترغیب دیتا ہے کیونکہ انجام کار غلبہ حق ہی کا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

1. ذرائع ابلاغ کا کردار: آج کے دور میں انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور سیٹلائٹ کے ذریعے اسلام کا پیغام دنیا کے ان دور دراز علاقوں اور گھروں میں بھی پہنچ رہا ہے جہاں پہلے پہنچنا ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ یہ اس حدیث کی صداقت کی ایک جدید صورت ہے۔

2. معذرت خواہانہ رویے سے بچنا: مسلمان اکثر مغلوبیت کے احساس میں احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں حوصلہ دیتی ہے کہ مستقبل اسلام کا ہے، ہمیں صرف اپنی ذمہ داری (تبلیغ اور کردار) ادا کرنی چاہیے۔

3. کردار کے ذریعے عزت: غیر مسلم ممالک میں لوگ مسلمانوں کے اچھے اخلاق دیکھ کر کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام کے سفیر بن کر جئیں تاکہ لوگ ہمارے کردار سے متاثر ہو کر اس "عزت" والے گروہ میں شامل ہوں۔

خلاصہ درس:

1. اسلام ایک عالمگیر دین ہے جو ہر چھوٹے بڑے گھر اور شہر و دیہات تک پہنچ کر رہے گا۔
2. اللہ تعالیٰ اس دین کو قبول کرنے والوں کو دنیا و آخرت کی حقیقی عزت عطا فرماتا ہے۔

3. غلبہ دین اللہ کا وعدہ ہے، ہمیں اس پر کامل یقین رکھتے ہوئے اپنے عمل کی اصلاح کرنی چاہیے۔

درس نمبر: 21۔ حدیث نمبر: 43

موضوع: جنت کی چابی اور اعمال کے دندانے

عَنْ وَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ قِيلَ لَهُ: أَلَيْسَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ؟ قَالَ: بَلَى، وَلَكِنْ لَيْسَ مِفْتَاحٌ إِلَّا لَهُ أَسْنَانٌ، فَإِنْ جِئْتَ بِمِفْتَاحٍ لَهُ أَسْنَانٌ فُتِحَ لَكَ، وَإِلَّا لَمْ يُفْتَحْ لَكَ. (رواه البخاري في ترجمة باب)

اردو ترجمہ: حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: "کیا 'لا الہ الا اللہ' جنت کی چابی نہیں ہے؟" انہوں نے جواب دیا: "کیوں نہیں (بالکل ہے)، لیکن ایسی کوئی چابی نہیں جس کے دندانے نہ ہوں۔ پس اگر تم ایسی چابی لاؤ گے جس کے دندانے ہوں تو (جنت کا دروازہ) تمہارے لیے کھول دیا جائے گا، ورنہ تمہارے لیے نہیں کھولا جائے گا"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ: اس کا لغوی معنی 'جنت کی چابی' ہے۔ یہاں کلمہ توحید کو ایک ایسی چابی سے تشبیہ دی گئی ہے جو جنت کے بند دروازوں کو کھولنے کی طاقت رکھتی ہے۔

2. أَسْنَانٌ: اس کا مطلب ہے 'دندانے'۔ جس طرح ایک عام چابی دندانوں کے بغیر تالہ نہیں کھول سکتی، اسی طرح کلمہ توحید کے ثمرات حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ مخصوص شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

تشریح:

1. کلمہ اور عمل کا جوڑ: محدثین فرماتے ہیں کہ کلمہ توحید بلاشبہ جنت کی چابی ہے، لیکن اس چابی کے دندانے "اللہ کے احکامات پر عمل کرنا اور گناہوں سے بچنا" ہیں۔

2. محض زبانی دعویٰ: علماء کے نزدیک صرف زبان سے کلمہ پڑھ لینا اور دل میں اس کی سچائی کا یقین رکھنا بنیاد تو ہے، لیکن مکمل کامیابی تبھی ممکن ہے جب انسان اپنی زندگی کو اس کلمے کے تقاضوں کے مطابق ڈھالے۔

3. چابی کی اہمیت: یہ تمثیل اس لیے دی گئی تاکہ واضح ہو جائے کہ جس طرح تالے کو کھولنے کے لیے چابی کے مخصوص دندانوں کا ہونا لازمی ہے، اسی طرح آخرت میں جنت کے درجات حاصل کرنے کے لیے فرائض کی ادائیگی اور حقوق العباد کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ جنت میں داخلے کے لیے محض زبانی دعویٰ کافی نہیں بلکہ اس کے لیے عملی تیاری بھی لازمی ہے۔ کلمہ طیبہ یقیناً جنت کی کنجی ہے، لیکن اس کنجی کے دندانے ہمارے وہ اعمالِ صالحہ ہیں جو شریعت نے ہم پر فرض کیے ہیں۔ یہ ہمیں اس غلط فہمی سے بچاتی ہے کہ صرف ایمان کا اقرار کر لینے سے تمام ذمہ داریاں ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ یہ واضح کرتی ہے کہ کنجی اسی وقت کام کرے گی جب اس میں صحیح دندانے یعنی اخلاص، نماز، روزہ اور دیگر احکام موجود ہوں گے۔ یہ پیرا گراف ہمیں اپنے عقیدے کے ساتھ ساتھ اپنے کردار اور عمل کی اصلاح کی طرف متوجہ کرتا ہے تاکہ ہم اللہ کے ہاں سرخرو ہو سکیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور رہنمائی:

1. عملی سستی اور غفلت: آج کے دور میں بہت سے مسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم نے کلمہ پڑھ لیا ہے، اب نمازوں کی پابندی یا حرام و حلال کی تمیز اتنی ضروری نہیں۔ یہ حدیث ہمیں یاد دلاتی ہے کہ بغیر دندانوں کی چابی سے جنت کا دروازہ نہیں کھلے گا۔

2. حقوق العباد کی پامالی: لوگ تسبیح وذکر کو تو اہمیت دیتے ہیں لیکن لین دین، سچائی اور اخلاقیات (جو کلمے کے عملی دندانے ہیں) کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اصل کامیابی کلمے کے عہد کو پورا کرنے میں ہے۔

3. ظاہری اور باطنی اصلاح: جدید دور میں لوگ صرف نام کے مسلمان ہونے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ سبق ہمیں پیغام دیتا ہے کہ اپنی باطنی توحید کو ظاہری اعمالِ صالحہ سے مضبوط کریں۔

خلاصہ درس:

1. کلمہ توحید جنت میں داخلے کی لازمی چابی ہے۔
2. نیکی اور اطاعت کے اعمال اس چابی کے دندانے ہیں۔
3. ایک مسلمان کو اپنے ایمان (چابی) کے ساتھ ساتھ اپنے اعمال (دندانوں) کی درستی کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

درس نمبر: 22۔ حدیث نمبر: 44

موضوع: نیکیوں کے اجر میں اضافے کا قانون اور اخلاصِ نیت کی اہمیت

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِمِثْلِهَا» (متفق علیہ)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب تم میں سے کوئی اپنے اسلام کو خوبصورت بنا لے (یعنی اس میں اخلاص اور سنت کی پیروی پیدا کر لے)، تو وہ جو بھی نیکی کرتا ہے، اس کے بدلے میں دس سے لے کر سات سو گنا تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اور وہ جو بھی برائی کرتا ہے تو وہ (صرف) اس کے برابر ہی لکھی جاتی ہے (یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملے)"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. أَحْسَنَ إِسْلَامَهُ: اس کا مطلب ہے اسلام کو "احسان" کے درجے پر لے جانا۔ یعنی ظاہری عبادت کے ساتھ ساتھ دل میں اللہ کا استحضار اور اخلاص پیدا کرنا۔
2. بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا: دس گنا اجر۔ یہ وہ کم سے کم اجر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس امت کے لیے مقرر فرمایا ہے۔
3. سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ: سات سو گنا اضافہ۔ یہ حدِ آخر نہیں ہے، بلکہ علماء فرماتے ہیں کہ بعض صورتوں میں اجر اس سے بھی کہیں زیادہ ہو جاتا ہے۔
4. بِمِثْلِهَا: ایک گناہ کے بدلے ایک ہی برائی کا لکھا جانا اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی صفتِ رحیمی کا مظہر ہے۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے اس عظیم قانونِ کرم کو بیان فرمایا ہے جو صرف امتِ محمدیہ کے لیے خاص ہے:

1. کوالٹی بمقابلہ کوانٹٹی: علماء فرماتے ہیں کہ اجر کا دس گنا سے سات سو گنا تک پہنچنا عمل کی مقدار پر نہیں بلکہ عمل کی کیفیت (Quality) پر منحصر ہے۔ جتنا زیادہ اخلاص ہو گا، اجر اتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ ایک روپیہ جو اللہ کے خوف اور محبت سے دیا جائے، وہ دکھاوے کے لاکھوں روپوں سے افضل ہے۔

2. مقام اور وقت کی فضیلت: محدثین نے وضاحت فرمائی ہے کہ بعض اوقات نیکی کی جگہ یا وقت کی وجہ سے بھی اجر میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔ جیسے حرم شریف میں ایک نیکی کا اجر ایک لاکھ گنا تک بڑھ جاتا ہے، یا رمضان المبارک میں نفلی عمل کا اجر فرض کے برابر ہو جاتا ہے۔

3.اللہ کی رحمت کا غلبہ: حدیث کے دوسرے حصے میں فرمایا کہ گناہ صرف ایک ہی لکھا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر احسان ہے کہ اس نے نیکی کے دروازے تو اجر کے لیے خوب کھول دیے، لیکن برائی کے معاملے میں صرف عدل سے کام لیا اور اسے بڑھایا نہیں۔

4.اسلام کا نکھار: "اسلام کو بہتر بنانا" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح کرتا رہے۔ اگر پہلے اس کی نیت میں تھوڑی کمی تھی تو اسے دور کرے، تاکہ اس کا ہر عمل سات سو گنا اجر کا مستحق بن سکے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے اور وہ نیک اعمال پر اجر و ثواب کے معاملے میں بے انتہا وسعت رکھتا ہے۔ جب بندہ اپنے اسلام کو حسنِ عمل اور اخلاص سے آراستہ کر لیتا ہے، تو اس کی ہر نیکی کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ ہمیں اخلاصِ نیت کی ترغیب دیتی ہے کیونکہ نیکی کی مقدار سے زیادہ اس کی معیار اور روح اجر کی زیادتی کا سبب بنتے ہیں۔ یہ ہمیں اللہ کی بے پناہ رحمت سے مایوس نہ ہونے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمانے کا شوق پیدا کرتی ہے تاکہ ہم اس کے فضلِ خاص کے مستحق بن سکیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1.مایوسی کا علاج: آج کے دور میں لوگ اپنے گناہوں کی کثرت دیکھ کر اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ اللہ کتنا کریم ہے؛ اگر ہم سچے دل سے ایک نیکی کریں تو وہ سینکڑوں گناہوں کو مٹانے کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

2.ڈیجیٹل نیکیوں کا فتنہ: سوشل میڈیا پر ہم اکثر نیکیاں شیئر کرتے ہیں۔ علماء کے نزدیک یہاں اخلاص کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اگر ہم نیکی صرف لائکس اور تعریف کے لیے کریں گے تو اجر دس گنا ہی رہے گا یا شاید ضائع ہو جائے، لیکن اگر اسے چھپا کر اور صرف اللہ کے لیے کریں گے تو وہ سات سو گنا تک پہنچ جائے گی۔

3.چھوٹی نیکی کو حقیر نہ سمجھنا: ہم بڑے بڑے منصوبوں کے چکر میں چھوٹی چھوٹی نیکیاں (جیسے کسی کو مسکرا کر دیکھنا، راستے سے پتھر ہٹانا) چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ حدیث سکھاتی ہے کہ چونکہ اجر کا اضافہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے کوئی بھی چھوٹی نیکی آپ کے ترازو کو بھاری کر سکتی ہے۔

4.توبہ اور استقامت: موجودہ پر فتن دور میں گناہوں سے بچنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ حدیث ہمیں حوصلہ دیتی ہے کہ اگر ہم اپنے اسلام کو "احسن" بنا لیں تو اللہ کی مدد ہمارے شاملِ حال ہو جائے گی اور نیکیوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔

خلاصہ درس:

1. اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے نیکیوں کا اجر دس سے سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ عطا فرماتا ہے۔
2. نیکی کے اجر میں اضافے کی بنیاد "اخلاص" اور "سنت کی پیروی" ہے۔
3. اللہ کا عدل یہ ہے کہ وہ ایک برائی پر ایک ہی سزا دیتا ہے، جو اس کی رحیمی کی دلیل ہے۔
4. مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی عبادات میں ظاہری دکھاوے کے بجائے باطنی حسن پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

درس نمبر:23۔حدیث نمبر:45

موضوع: ایمان کی پہچان اور گناہ سے بچنے کا فطری معیار

وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ: «مَا الْإِيمَانُ قَالَ إِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ قَالَ يَا رَسُولَ اللهِ فَمَا الْإِثْمُ قَالَ إِذَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ شَيْءٌ فَدَعْهُ». (رَوَاهُ أَحْمد)

اردو ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: "ایمان کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "جب تمہیں تمہاری نیکی خوشی دے اور تمہاری برائی تمہیں غمزدہ کردے، تو تم مومن ہو"۔ اس شخص نے پھر عرض کیا: "یارسول اللہ! گناہ کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "جب تمہارے دل میں کوئی بات کھٹکنے لگے (یعنی خلجان پیدا ہو) تو اسے چھوڑ دو"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. سَرَّتْکَ: اس کا مادہ 'سرور' ہے، جس کا مطلب ہے ایسی خوشی جو دل کی گہرائیوں میں محسوس ہو۔ یہاں مراد وہ خوشی ہے جو اللہ کی توفیق اور ثواب کی امید پر حاصل ہو۔
2. سَاءَتْکَ: یہ 'سوء' سے ہے، یعنی غمزدہ کرنا یا تکلیف پہنچانا۔ برائی پر دکھ اس بات کی علامت ہے کہ دل میں ابھی اللہ کا خوف باقی ہے۔
3. حَاکَ فِي نَفْسِکَ: اس کا مطلب ہے دل میں کھٹکنا، چبھنا یا خلجان پیدا ہونا۔ یہ اس کیفیت کو کہتے ہیں جب انسان کا ضمیر کسی کام کو کرنے پر مطمئن نہ ہو اور اندر سے ایک آواز آئے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔
4. فَدَعْهُ: اسے چھوڑ دو۔ یہ امر کا صیغہ ہے جو تقویٰ کے اعلیٰ معیار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے ایمان اور گناہ کو سمجھنے کے لیے ایک ایسا فطری اور نفسیاتی قاعدہ بیان فرمایا ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کی تشریح میں درج ذیل نکات بیان فرمائے ہیں:

1. مومن کے قلب کی حساسیت: محدثین فرماتے ہیں کہ مومن کا دل ایک صاف شفاف آئینے کی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح صاف آئینے پر ایک چھوٹا سا دھبہ بھی واضح نظر آتا ہے، اسی طرح مومن کا دل ایک چھوٹی سی برائی پر بھی بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، گناہ گار یا منافق کا دل گناہوں کی وجہ سے سیاہ ہو جاتا ہے، اسے بڑے سے بڑا گناہ کرکے بھی دکھ محسوس نہیں ہوتا۔

2. نیکی پر خوشی کی حقیقت: نیکی پر خوش ہونے کا مطلب اپنی بڑائی یا تکبر نہیں، بلکہ یہ خوشی ہے کہ "اللہ نے مجھے اپنے حضور جھکنے یا کسی کی مدد کرنے کی توفیق دی"۔ علماء کے نزدیک یہ خوشی ایمان کی مٹھاس کی علامت ہے۔

3. برائی پر غم ایمان کی دلیل: گناہ پر ندامت اور دکھ محسوس ہونا اس بات کی گواہی ہے کہ بندے کا تعلق اپنے رب سے ٹوٹا نہیں ہے۔ یہی دکھ اسے توبہ کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر گناہ پر دکھ ختم ہو جائے تو یہ دل کی موت کی علامت ہے۔

4. گناہ کا باطنی معیار: حضور ﷺ نے گناہ کی ایک بہت جامع تعریف فرمائی کہ جس کام کو کرتے ہوئے دل میں خلجان ہو اور یہ ڈر ہو کہ لوگ دیکھ لیں گے تو کیا کہیں گے، وہ گناہ ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ تقویٰ یہ ہے کہ انسان مشتبہ چیزوں (جن میں شک ہو) کو بھی چھوڑ دے تاکہ وہ صریح حرام سے بچ سکے۔

5. نفسِ لوامہ کا کردار: انسانی نفس میں ایک صفت "نفسِ لوامہ" (ملامت کرنے والا ضمیر) ہے۔ یہ حدیث اسی ضمیر کو بیدار کرنے کی تلقین کرتی ہے کہ اپنے باطنی مفتی سے فتویٰ لو۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ ایمان محض ایک رسمی دعویٰ نہیں بلکہ یہ دل کی اس بیداری کا نام ہے جہاں انسان کا ضمیر اللہ کے احکامات کے معاملے میں حساس ہو جاتا ہے۔ ایک سچے مومن کی پہچان یہ ہے کہ جب اس سے کوئی نیکی سرزد ہو تو اسے دلی مسرت اور اطمینان حاصل ہو، اور اگر بتقاضائے بشریت اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا دل بے چین ہو جائے اور وہ اللہ کے خوف سے کانپ اٹھے۔ یہ حدیث ہمیں اپنے اندرونی احوال کے جائزے کی دعوت دیتی ہے کہ ہم اپنے دل میں نیکی کی تڑپ اور گناہ کی نفرت کو پرکھیں، کیونکہ جس کام کو کرتے ہوئے انسان کا ضمیر ملامت کرے، وہی گناہ ہے جس سے بچنا لازمی ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. ضمیر کی آواز اور جدید دنیا: آج کے مادی دور میں ہم اکثر اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیتے ہیں۔ رشوت، جھوٹ یا دھوکہ دہی کرتے وقت شروع میں دل دھڑکتا ہے اور خلجان ہوتا ہے، لیکن بار بار کرنے سے وہ احساس ختم ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ اپنے دل کی اس حساسی کو بچا کر رکھیں۔

2. مشتبہ معاملات (Doubtful Matters): آج کل بہت سے نئے معاملات ایسے ہیں جن کی حلت و حرمت میں بحث ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملے میں مستند علماء کا واضح فتویٰ نہ ملے اور آپ کا دل اسے قبول کرنے میں ہچکچائے، تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خلجان کی صورت میں اسے چھوڑ دیا جائے۔

3. سوشل میڈیا اور گناہ: انٹرنیٹ پر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو بظاہر گناہ نہیں لگتیں لیکن وہ دل کی نورانیت کو ختم کر دیتی ہیں۔ اگر کسی پوسٹ یا ویڈیو کو دیکھتے ہوئے آپ کا دل بے چین ہو، تو سمجھ لیں کہ یہ آپ کے ایمان کا الارم ہے، اسے فوراً بند کر دیں۔

4. خود احتسابی (Self-Accountability): یہ حدیث ہمیں ہر رات اپنا محاسبہ کرنے کا طریقہ سکھاتی ہے۔ دن بھر کے کاموں کو یاد کریں؛ جن پر خوشی ہو ان پر شکر ادا کریں اور جن پر دکھ ہو ان پر توبہ کریں۔

خلاصہ درس:

1. نیکی پر خوشی اور گناہ پر رنج محسوس ہونا ایمان کی سچائی کی علامت ہے۔
2. جس کام کو کرتے ہوئے دل میں شک اور بے چینی ہو، اسے چھوڑ دینا ہی تقویٰ ہے۔
3. ایمان صرف نام نہیں بلکہ دل کی ایک خاص کیفیت اور حساسیت کا نام ہے۔
4. توبہ کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے جب تک گناہ پر ندامت کا احساس باقی ہے۔

درس نمبر: 24۔ حدیث نمبر: 46

موضوع: اسلام، ایمان، ہجرت اور جہاد کے فضائل و کمالات

عَنْ عَمْرِو بن عبسة قَالَ: أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ من تبعك عَلَى هَذَا الْأَمْرِ قَالَ «حُرٌّ وَعَبْدٌ» قُلْتُ مَا الْإِسْلَامُ قَالَ «طِيبُ الْكَلَامِ وَإِطْعَامُ الطَّعَامِ» قُلْتُ مَا الْإِيمَانُ قَالَ «الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ» قَالَ قُلْتُ أَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ قَالَ «مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ» قَالَ قُلْتُ أَيُّ الْإِيمَانِ أَفْضَلُ قَالَ «خُلُقٌ حَسَنٌ» قَالَ قُلْتُ أَيُّ الصَّلَاةِ أَفْضَلُ قَالَ «طُولُ الْقُنُوتِ» قَالَ قُلْتُ أَيُّ الْهِجْرَةِ أَفْضَلُ قَالَ «أَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ عَزَّ وَجَلَّ» قَالَ قُلْتُ فَأَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ قَالَ «مَنْ عُقِرَ جَوَادُهُ وَأُهْرِيقَ دَمُهُ» قَالَ قُلْتُ أَيُّ السَّاعَاتِ أَفْضَلُ قَالَ «جَوْفُ اللَّيْلِ الْآخِرُ»۔ (رواه أحمد)

اردو ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! اس معاملے (دینِ اسلام) میں کون آپ کے ساتھ ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "آزاد اور غلام"۔ میں نے عرض کیا: "اسلام کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "شیریں کلامی اور کھانا کھلانا"۔ میں نے عرض کیا: "ایمان کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "صبر اور سخاوت"۔ میں نے عرض کیا: "کون سا اسلام افضل ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"۔ میں نے عرض کیا: "کون سا ایمان افضل ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "عمدہ اخلاق"۔ میں نے عرض کیا: "کون سی نماز افضل ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "طویل قیام والی"۔ میں نے عرض کیا: "کون سی ہجرت افضل ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس چیز کو چھوڑ دینا جسے تمہارا رب ناپسند فرمائے"۔ میں نے

عرض کیا: "کون سا جہاد افضل ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس شخص کا جہاد جس کا گھوڑا مارا جائے اور اس کا اپنا خون بہا دیا جائے"۔ میں نے عرض کیا: "کون سا وقت سب سے افضل ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "رات کا آخری حصہ"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. حُرٌّ وَعَبْدٌ: آزاد سے مراد حضرت ابو بکر صدیق اور غلام سے مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہما ہیں جو ابتدائے اسلام میں آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔
2. الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ: صبر سے مراد اللہ کی اطاعت پر ڈٹ جانا اور سماحت سے مراد کشادہ دلی اور سخاوت ہے۔
3. طُولُ الْقُنُوتِ: اس سے مراد نماز میں لمبا قیام ہے، جس میں تلاوتِ قرآن زیادہ کی جائے۔
4. جَوْفُ اللَّيْلِ الْآخِرُ: رات کا آخری تہائی حصہ جس میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔

تشریح:

اس طویل اور جامع حدیثِ مبارکہ کی وضاحت میں علماء نے درج ذیل اہم نکات بیان فرمائے ہیں:

1. ابتدائے اسلام کی سادگی: حضرت عمرو بن عبسہ ان خوش نصیبوں میں سے تھے جنہوں نے مکہ میں اس وقت اسلام قبول کیا جب بہت کم لوگ مسلمان تھے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا جواب "آزاد اور غلام" اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اسلام کا پیغام ہر طبقے کے لیے یکساں ہے۔

2. اسلام کی معاشرتی روح: آپ ﷺ نے اسلام کی تعریف "شیریں کلامی" اور "کھانا کھلانے" سے فرمائی۔ علماء کے نزدیک یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام صرف عبادات کا نام نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت اور اچھے بول بھی دین کا جوہر ہیں۔

3. ایمان اور اخلاق کا رشتہ: جب افضل ایمان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے "خوش اخلاقی" کا ذکر فرمایا۔ محدثین فرماتے ہیں کہ بندے کے ایمان کا کمال اس کے برتاؤ سے ظاہر ہوتا ہے۔

4. حقیقی ہجرت اور جہاد: علماء نے وضاحت فرمائی ہے کہ ظاہری ہجرت (وطن چھوڑنا) کے ساتھ باطنی ہجرت یعنی گناہوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح جہاد کا بلند ترین مقام اپنی جان اور مال اللہ کی راہ میں فنا کر دینا ہے۔

5. قبولیت کا وقت: رات کا آخری حصہ عبادت کے لیے سب سے موزوں ہے کیونکہ اس وقت اللہ کا بندے سے قرب بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اسلام اور ایمان کا دائرہ کار انتہائی وسیع ہے جو صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ اس میں بہترین اخلاق، دوسروں کو کھانا کھلانا، نرم گفتگو کرنا اور اپنی زبان و ہاتھ سے لوگوں کو سلامتی فراہم کرنا بھی شامل ہے۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ ایمان کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان کا خلق اچھا ہو اور وہ اللہ کی رضا کی خاطر صبر و سخاوت کا پیکر بن جائے۔ حضور ﷺ کی یہ جامع تعلیمات ہمیں ایک ایسے مثالی معاشرے کی طرف لے جاتی ہیں جہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کامل توازن ہو، اور مومن کی پہچان اس کے صبر، اخلاق اور دوسروں کے لیے خیر خواہی کے جذبے سے ہو۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. سوشل میڈیا اور طیب الکلام: آج کے دور میں "طیب الکلام" کی اشد ضرورت ہے۔ انٹرنیٹ پر کسی کی دل آزاری کرنا یا سخت الفاظ استعمال کرنا اسلام کی روح کے خلاف ہے۔

2. بھوک اور افلاس کا خاتمہ: "اطعام الطعام" یعنی کھانا کھلانا آج کے معاشی بحران میں سب سے بڑی نیکی ہے۔ علماء کے نزدیک اپنے پڑوسیوں اور مستحقین کی خبر گیری کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

3. صبر اور سماحت کا فقدان: معاشرے میں عدم برداشت بڑھ گئی ہے۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ دینداری صبر اور دوسروں کے لیے کشادگی پیدا کرنے کا نام ہے۔

4. باطنی ہجرت: آج کل لوگ نیکی کی طرف مائل ہونا چاہتے ہیں مگر گناہ نہیں چھوڑتے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہمیں یاد دلاتا ہے کہ سب سے بہتر ہجرت اللہ کی ناپسندیدہ باتوں کو زندگی سے نکال دینا ہے۔

خلاصہ درس:

1. اسلام کی بنیاد نرم کلامی اور حاجت مندوں کی خدمت پر ہے۔
2. ایمان کا کمال صبر، سخاوت اور عمدہ اخلاق سے حاصل ہوتا ہے۔
3. بہترین ہجرت ہر اس کام کو چھوڑنا ہے جس سے اللہ ناراض ہو۔
4. تہجد کا وقت اللہ سے مانگنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

باب الکبائر وعلامات النفاق

درس نمبر: 25۔ حدیث نمبر: 49

موضوع: سب سے بڑے گناہ اور ان کی سنگینی

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَمَّا سُئِلَ أَيُّ الذَّنْبِ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ؟ قَالَ: «أَنْ تَدْعُوَ لِلَّهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ» قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: «ثُمَّ أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ أَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ» قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: «ثُمَّ أَنْ تُزَانِيَ بِحَلِيلَةِ جَارِكَ» فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ تَصْدِيقَهَا: (وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ). (متفق علیہ)

اردو ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: "اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کہ تم اللہ کا کسی کو شریک (برابر) ٹھہراؤ حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے"۔ اس نے عرض کیا: "پھر کون سا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کر دو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانا کھائے گی (یعنی رزق میں شریک ہو گی)"۔ اس نے عرض کیا: "پھر کون سا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو"۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں (سورہ فرقان کی) یہ آیت نازل فرمائی: "اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے، اور نہ اس جان کو ناحق قتل کرتے ہیں جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اور نہ وہ زنا کرتے ہیں"۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1. نِدًّا: اس کا لغوی معنی برابر، شریک یا مشابہ کے ہے۔ یہاں مراد اللہ کی ذات، صفات یا حقوقِ عبادت میں کسی اور کو اس کے برابر جگہ دینا ہے۔
2. خَشْيَةَ أَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ: اس کا مطلب ہے "اس خوف سے کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا"۔ یہ اس دور کی جہالت کی طرف اشارہ ہے جہاں لوگ فقر و فاقہ کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے۔
3. حَلِيلَةَ جَارِكَ: پڑوسی کی بیوی۔ 'حلیل' 'حلال' سے ہے، یعنی وہ عورت جو پڑوسی کے لیے حلال ہے لیکن تمہارے لیے مکمل طور پر حرام اور امانت ہے۔

4. اُثَاثًا: اس کا معنی سخت گناہ یا جہنم کی ایک وادی ہے جہاں گناہ گاروں کو سزا دی جائے گی۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے انسانی زندگی کے تین بڑے شعبوں (ایمان، جان اور آبرو) کے حوالے سے عظیم ترین گناہوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کی وضاحت میں درج ذیل پہلو بیان کیے ہیں:

1. حقِ خالق کی پامالی: سب سے بڑا گناہ شرک ہے کیونکہ یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ جب انسان تسلیم کرتا ہے کہ پیدا اللہ نے کیا، تو عبادت کسی اور کی کرنا بدترین احسان فراموشی اور ظلمِ عظیم ہے۔

2. رحم کے رشتے کا قتل: اولاد کو رزق کے ڈر سے قتل کرنا دوہرے گناہ کا مجموعہ ہے؛ ایک ناحق قتل اور دوسرا اللہ کی صفتِ رزاقیت پر بے یقینی۔ علماء کے نزدیک یہ سنگدلی کی انتہا ہے کہ ایک باپ اپنے ہی جگر گوشے کو معاشی بوجھ سمجھ کر ختم کر دے۔

3. امانت و آبرو کی پامالی: زنا بذاتِ خود کبیرہ گناہ ہے، لیکن پڑوسی کی بیوی کے ساتھ اسے "اکبر الذنوب" (بڑے گناہوں) میں اس لیے رکھا گیا کیونکہ پڑوسی کی آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری زیادہ ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ پڑوسی آپ کے گھر کا محافظ ہونا چاہیے، اگر وہی نقب لگائے تو یہ بدترین خیانت اور معاشرتی امن کی تباہی ہے۔

4. قرآنی تصدیق: اس حدیث کی عظمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک کی آیت نازل فرما کر حضور ﷺ کے ارشاد کی تصدیق فرمائی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مومنین کی بنیادی صفات ان تینوں گناہوں سے بچنا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے بڑے اور سنگین گناہ وہ ہیں جو خالق کی توحید پر ضرب لگائیں یا مخلوق کے مقدس ترین رشتوں اور انسانی حقوق کو پامال کریں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا سب سے بڑا ظلم ہے کیونکہ وہی اکیلا خالق ہے، اس کے بعد اپنی اولاد کو معاشی بوجھ سمجھ کر قتل کرنا اور اپنے پڑوسی کی عزت پر ڈاکہ ڈالنا ایسے بھیانک جرائم ہیں جو انسانیت اور معاشرتی امن کی جڑیں کاٹ دیتے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں تاکید کرتی ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں توحید کی حفاظت کریں اور دوسروں کی جان، مال اور عزت کو اللہ کی عطا کردہ حرمت سمجھ کر اس کا مکمل پاس رکھیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور علمی رہنمائی:

1. جدید شرک: آج کل لوگ بتوں کی پوجا تو نہیں کرتے، لیکن معاشی مفادات، طاقتور شخصیات یا اپنی خواہشات کو اللہ کے حکم پر ترجیح دینا "شرکِ خفی" کی صورتیں ہیں۔ یہ حدیث ہمیں خالص توحید کی دعوت دیتی ہے۔

2. معاشی اسقاطِ حمل (Abortion): آج کے دور میں بھی بہت سے لوگ رزق کی تنگی یا کثرتِ اولاد کے ڈر سے پیدائش سے پہلے ہی بچوں کو ضائع کروا دیتے ہیں۔ یہ عمل اس حدیث میں بیان کردہ "اولاد کے قتل" کی ہی ایک جدید اور گھناؤنی شکل ہے۔ اللہ رزق کا ضامن ہے، انسان نہیں۔

3. پڑوسی کے حقوق اور سوشل میڈیا: جدید دور میں پڑوس صرف دیوار کے ساتھ والا گھر نہیں، بلکہ ورک پلیس (دفتر) اور سوشل میڈیا گروپس بھی ایک طرح کی پڑوس کی ہی شکلیں ہیں۔ کسی کے بھروسے کا فائدہ اٹھا کر اس کی آبرو پر حملہ کرنا یا اخلاقی حدود پار کرنا اس حدیث کی رو سے بدترین گناہ ہے۔

4. اخلاقی دیوالیہ پن: یہ حدیث سکھاتی ہے کہ معاشرے کی بنیاد 'اعتماد' پر ہے۔ اگر انسان اپنے خالق، اپنی اولاد اور اپنے پڑوسی کے ساتھ مخلص نہیں، تو وہ معاشرے کے لیے ناسور ہے۔

خلاصہ درس:

1. شرک اللہ کی نظر میں ناقابل معافی اور بدترین گناہ ہے۔
2. رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کے خوف سے اولاد کی جان لینا یا پیدا نہ ہونے دینا حرام ہے۔
3. پڑوسی کا حق بہت عظیم ہے، اس کی آبرو سے کھلواڑ کرنا ایمان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔
4. نجات صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو توحید پر قائم رہیں اور انسانی جان و آبرو کا احترام کریں۔

درس نمبر:26۔حدیث نمبر:50،51

موضوع: کبیرہ گناہوں کی پہچان اور ان کی سنگینی

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْكَبَائِرُ الْإِشْرَاكُ بِاللَّهِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِينِ الْغُمُوسِ» . (رواہ البخاری) وَفِي رِوَايَةِ أَنَسٍ: «وَشَهَادَةُ الزُّورِ» بَدَلُ: «الْيَمِينُ الْغُمُوسِ»

اردو ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی جان کو (ناحق) قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا (الیمین الغموس)۔" اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں "جھوٹی قسم" کی جگہ "جھوٹی گواہی" کے الفاظ ہیں۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. الکبائر: یہ کبیرہ کی جمع ہے، اس سے مراد وہ بڑے گناہ ہیں جن پر شریعت میں حد (سزا) مقرر ہے، یا جن پر قرآن و حدیث میں سخت وعید (ڈراوا) سنایا گیا ہے، یا جنہیں کفر کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔
2. عقوق: اس کا لغوی معنی کاٹنا ہے، اصطلاح میں اس سے مراد والدین کو دکھ دینا، انہیں تنگ کرنا یا ان کی نافرمانی کرنا ہے۔
3. الیمین الغموس: ایسی جھوٹی قسم جو جان بوجھ کر کسی گزرے ہوئے معاملے پر کھائی جائے تاکہ کسی کا حق مارا جا سکے۔ اسے 'غموس' اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ قسم کھانے والے کو گناہ اور پھر جہنم میں ڈبو دیتی ہے۔
4. شہادۃ الزور: حق کو چھپانے کے لیے یا کسی کو ناحق فائدہ پہنچانے کے لیے جھوٹی گواہی دینا۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے ان مہلک گناہوں کا ذکر فرمایا ہے جو انسانی معاشرے اور فرد کے ایمان کو تباہ کر دیتے ہیں۔ علماء اور محدثین نے اس کی شرح میں درج ذیل نکات بیان فرمائے ہیں:

1. شرک کی سنگینی: علماء فرماتے ہیں کہ شرک تمام گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ معاف کر سکتا ہے لیکن شرک کو بغیر توبہ کے معاف نہیں فرمائے گا۔ یہ خالق کی توہین اور فطرت سے بغاوت ہے۔

2. والدین کے حقوق: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ محدثین کے نزدیک والدین کی نافرمانی (عقوق) کرنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ یہ انسان کی دیگر عبادات کے اجر کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اگر والدین مشرک بھی ہوں، تب بھی دنیاوی معاملات میں ان کی خدمت اور ان سے حسنِ سلوک ضروری ہے، سوائے اس کے کہ وہ گناہ کا حکم دیں۔

3. انسانی جان کی حرمت: ناحق قتل کو کبیرہ گناہوں میں دوسرے یا تیسرے نمبر پر رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں انسانی زندگی کتنی قیمتی ہے۔ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

4. جھوٹی قسم اور گواہی کا وبال: علماء فرماتے ہیں کہ جھوٹی گواہی اور جھوٹی قسم معاشرے کے عدالتی اور سماجی نظام کی جڑیں کاٹ دیتی ہیں۔ یہ دونوں گناہ 'حقوق العباد' سے تعلق رکھتے ہیں، جن کا وبال انتہائی سخت ہے کیونکہ ان کے ذریعے دوسروں پر ظلم کیا جاتا ہے۔

ان احادیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ گناہِ کبیرہ وہ مہلک بیماریاں ہیں جو انسان کے ایمان کو کھوکھلا کر دیتی ہیں اور اسے جہنم کے مستحق بنا دیتی ہیں۔ اللہ کے ساتھ شرک، والدین کی نافرمانی، ناحق قتل اور جھوٹی گواہی یا جھوٹی قسم ایسے سنگین جرائم ہیں جنہیں آپ ﷺ نے "موبقات" یعنی ہلاک کر دینے والے کام قرار دیا ہے۔ خاص طور پر جھوٹی گواہی کو شرک اور قتل کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں سچائی اور عدل کی کتنی اہمیت ہے۔ یہ پیرا گراف ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ ہم ان بڑے گناہوں سے ہر حال میں بچیں، کیونکہ یہ نہ صرف آخرت کی دائمی بربادی ہے بلکہ دنیا میں بھی معاشرتی بگاڑ اور ذلت کا سبب بنتے ہیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور علمی رہنمائی:

1. والدین کی خدمت اور اولڈ ہومز: موجودہ دور میں مادیت پرستی کی وجہ سے والدین کو بوجھ سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ حدیث ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ان کی نافرمانی کرنا یا انہیں بڑھاپے میں تنہا چھوڑ دینا 'کبیرہ گناہ' ہے جو دنیا اور آخرت دونوں برباد کر سکتا ہے۔

2. عدالتی نظام اور جھوٹے گواہ: آج کل کچہریوں اور عدالتوں میں محض چند پیسوں کے عوض جھوٹے گواہ دستیاب ہوتے ہیں۔ علماء کے نزدیک یہ 'شہادۃ الزور' ہے، جو پورے معاشرے میں ناانصافی پھیلاتا ہے اور اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

3. معاشرتی اعتماد کا فقدان: 'الیمین الغموس' (جھوٹی قسم) کے ذریعے کاروباری لین دین اور باہمی معاملات میں دھوکہ دہی عام ہو چکی ہے۔ یہ حدیث سکھاتی ہے کہ وقتی فائدے کے لیے اللہ کے نام کی جھوٹی قسم کھانا اپنے آپ کو جہنم کے گڑھے میں گرانے کے مترادف ہے۔

4. انسانیت کا احترام: دہشت گردی، فرقہ واریت یا ذاتی دشمنی کی بنیاد پر انسانی جان لینا آج کا بڑا المیہ ہے۔ حدیث نبوی ﷺ ہر جان کے احترام کا سبق دیتی ہے۔

خلاصہ درس:

1. کبیرہ گناہ انسان کے ایمان کو ناقص کر دیتے ہیں اور اسے سخت سزا کا مستحق بناتے ہیں۔
2. اللہ کی توحید کے بعد سب سے بڑی ذمہ داری والدین کی خدمت اور انسانی جان کی حفاظت ہے۔
3. زبان کا غلط استعمال (جھوٹی قسم اور جھوٹی گواہی) انسان کو گناہوں کی دلدل میں ڈبو دیتا ہے۔
4. نجات صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ان بڑے گناہوں سے مکمل اجتناب کیا جائے اور ان پر سچی توبہ کی جائے۔

درس نمبر: 27۔ حدیث نمبر: 52

موضوع: ہلاک کر دینے والے سات بڑے گناہ

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا هُنَّ؟ قَالَ: «الشِّرْكُ بِاللَّهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ، وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ». (متفق عليه)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سات ہلاک کر دینے والی چیزوں (گناہوں) سے بچو۔" صحابہ کرام نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! وہ کیا ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، کسی جان

کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن میدان سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا اور پاکدامن، ایمان والی بھولی بھالی عورتوں پر تہمت لگانا"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. اَلْمُوبِقَاتِ: یہ 'ایباق' سے نکلا ہے جس کا معنی ہے ہلاک کر دینا۔ یہاں مراد وہ گناہ ہیں جو انسان کی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر دیتے ہیں۔
2. اَلسِّحْرُ: جادو؛ اس سے مراد وہ باطل طریقے ہیں جن کے ذریعے لوگوں کو دھوکہ دیا جائے یا نقصان پہنچایا جائے۔
3. اَلرِّبَا: سود؛ اس کا لغوی معنی زیادتی ہے، شرعاً اس سے مراد مال پر وہ اضافہ ہے جو کسی بدلے کے بغیر لیا جائے۔
4. اَلزَّحْفِ: ٹڈی دل لشکر؛ یہاں مراد میدانِ جنگ میں دشمن کے سامنے سے فرار اختیار کرنا ہے۔
5. قَذْفُ: پھینکنا؛ اصطلاح میں کسی پاکدامن عورت پر بدکاری کا الزام لگانا مراد ہے۔

تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں حضور ﷺ نے سات ایسے بڑے جرائم کا ذکر فرمایا ہے جو پورے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کر دیتے ہیں۔ علماء اور محدثین نے ان کی وضاحت درج ذیل انداز میں فرمائی ہے:

1. عقیدے کی خرابی (شرک): محدثین فرماتے ہیں کہ شرک تمام گناہوں کی جڑ ہے اور یہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔ اس کا مطلب اللہ کی ذات، صفات یا حقوق میں کسی اور کو اس کے برابر سمجھنا ہے۔

2. جادو کا فتنہ: علماء کے نزدیک جادو سیکھنا اور کرنا دونوں کفر کے قریب ہیں کیونکہ اس میں اکثر شیاطین سے مدد لی جاتی ہے اور اس کا مقصد دوسروں کو ناحق نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔

3. انسانی جان کی حرمت: ناحق قتل معاشرے میں دہشت پھیلاتا ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اسلام میں ایک جان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

4. معاشی استحصال (سود اور یتیم کا مال): سود غریب کا خون چوستا ہے جبکہ یتیم کا مال کھانا اخلاقی پستی کی انتہا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ان دونوں کاموں سے مال میں برکت ختم ہو جاتی ہے اور معاشرے میں بے سکونی پھیلتی ہے۔

5. قومی غداری (میدان سے فرار): جنگ کے نازک موقع پر پیٹھ پھیرنا بزدلی اور ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔ محدثین کے مطابق اگر دشمن مسلمانوں سے دگنا یا اس سے کم ہو تو فرار ہونا کبیرہ گناہ ہے۔

6. کردار کشی (تہمت): کسی پاکدامن عورت کی عزت پر حملہ کرنا خاندانوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ علماء کے نزدیک ایسی عورتوں کو "غافلات" (بے خبر) اس لیے کہا گیا کیونکہ وہ ایسے گناہوں کا سوچ بھی نہیں سکتیں، ان پر الزام لگانا بدترین ظلم ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ انسان کو ان سات مہلک اور تباہ کن گناہوں سے ہر صورت بچنا چاہیے جو اس کی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر دینے والے ہیں۔ شرک، جادو، ناحق قتل، سود خوری، یتیم کا مال کھانا، میدانِ جنگ سے فرار اور پاکدامن مومن عورتوں پر تہمت لگانا ایسے بھیانک جرائم ہیں جو معاشرے کی بنیادیں ہلا دیتے ہیں اور اللہ کے غضب کا باعث بنتے ہیں۔ یہ پیراگراف ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کا ہمہ وقت جائزہ لیں اور ان ہلاک کر دینے والی برائیوں سے دور رہ کر اپنے ایمان کی مادی اور معنوی حفاظت کریں کیونکہ ان سے اجتناب ہی حقیقی کامیابی کی ضمانت ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. **جادو ٹونے کا رواج:** آج کل معمولی پریشانیوں پر لوگ عاملوں اور جادو گروں کے پاس جاتے ہیں۔ جہاں اپنا ایمان و عمل بھی برباد کر کے واپس لوٹتے ہیں، انبیائے کرام اور صحابہ کرام پریشانیوں اور مسائل کے حل کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے نا کہ عامل لٹیروں کی طرف، آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں عاملوں کے پاس شاید کوئی ایسا بٹن ہے جسے وہ دبائیں گے اور ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، لوگوں کو اللہ پر یقین نہیں اور دجالیت کی دنیا سے تعلق رکھنے والے عاملوں، جعلی پیروں پر یقین ہے۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ جادو ہلاک کر دینے والا عمل ہے، ہمیں صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔

2. سودی نظامِ معیشت: موجودہ معاشی دور میں سود ایک کینسر کی طرح پھیل چکا ہے۔ ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی تجارت اور لین دین کو سودی آلودگی سے پاک رکھے تاکہ اس کا رزق حلال رہے۔ اللہ نے سود کو حرام اور تجارت کو جائز قرار دیا ہے، اور سودی لین دین والوں کے لیے سخت سے سخت سزا کا اعلان کیا ہے۔

3. کمزوروں کا استحصال: یتیموں کے حقوق کی پامالی جائیداد کے جھگڑوں میں عام ہے۔ یہ سبق ہمیں یاد دلاتا ہے کہ یتیم کا مال کھانا در حقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھرنا ہے۔

4. سوشل میڈیا پر بہتان تراشی: آج کل انٹرنیٹ پر کسی کی پگڑی اچھالنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ کسی بھی عورت یا مرد پر بغیر ثبوت کے بدکاری کا الزام لگانا "قذف" کے زمرے میں آتا ہے، جو ہلاک کر دینے والا گناہ ہے۔

خلاصہ درس:

1. ایمان کی حفاظت کے لیے شرک اور جادو جیسی خرافات سے دور رہنا لازمی ہے۔
2. انسانی جان، مال اور عزت کی حفاظت اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔
3. معاشرتی اور معاشی انصاف کے بغیر ایک مومن کی زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔
4. زبان اور عمل کے ذریعے دوسروں کی عزت پر حملہ کرنا اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

درس نمبر: 28۔ حدیث نمبر: 53، 54

موضوع: گناہِ کبیرہ کے وقت ایمان کی کیفیت اور اس کی نزاکت

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِينَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِينَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَنْتَهِبُ نُهْبَةً ذَاتَ شَرَفٍ يَرْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهِ أَبْصَارَهُمْ فِيهَا حِينَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَغُلُّ أَحَدُكُمْ حِينَ يَغُلُّ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَإِيَّاكُمْ إِيَّاكُمْ». (متفق عليه) وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ: «وَلَا يَقْتُلُ حِينَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ» . قَالَ عِكْرِمَةُ: قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ: كَيْفَ يُنْزَعُ الْإِيمَانُ مِنْهُ؟ قَالَ: هَكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ ثُمَّ أَخْرَجَهَا فَإِنْ تَابَ عَادَ إِلَيْهِ هَكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ وَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ: لَا يَكُونُ هَذَا مُؤْمِنًا تَامًّا وَلَا يَكُونُ لَهُ نُورُ الْإِيمَانِ.

(رواه البخاری)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "کوئی زنا کرنے والا جس وقت زنا کرتا ہے تو وہ (کامل) مومن نہیں ہوتا، اور کوئی شراب پینے والا جس وقت شراب پیتا ہے وہ مومن نہیں ہوتا، اور کوئی چور جس وقت چوری کرتا ہے وہ مومن نہیں ہوتا، اور کوئی شخص ایسی بڑی لوٹ مار نہیں کرتا جس کی طرف لوگ (بے بسی سے) آنکھیں اٹھا کر دیکھیں جب وہ لوٹ رہا ہو اور وہ مومن ہو، اور تم میں سے کوئی خیانت نہیں کرتا جس وقت وہ خیانت کر رہا ہو اور وہ مومن ہو؛ پس تم (ان گناہوں سے) بچو، بچو!"۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی

روایت میں یہ بھی ہے: "اور کوئی قاتل جس وقت قتل کرتا ہے وہ مومن نہیں ہوتا"۔ حضرت عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس سے پوچھا کہ ایمان اس سے کیسے نکل جاتا ہے؟ انہوں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں ڈالیں (جکڑیں) اور پھر انہیں باہر نکال دیا (اور فرمایا کہ اس طرح)، پھر اگر وہ توبہ کرلے تو ایمان واپس آجاتا ہے (پھر انگلیاں جکڑ کر دکھائیں)۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ایسا شخص "کامل مومن" نہیں رہتا اور اس کے پاس "ایمان کا نور" نہیں رہتا۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1. نُهْبَةً ذَاتَ شَرَفٍ: ایسی لوٹ مار جو سرِ عام ہو اور لوگ اپنی قیمتی چیزوں کو لٹتا دیکھ کر بے بسی سے پکار رہے ہوں۔ یہ جرم کی سنگینی کو ظاہر کرتا ہے۔
2. يَغُلُّ: یہ 'غُلول' سے ہے، جس کا مطلب مالِ غنیمت یا سرکاری امانت میں خیانت کرنا ہے۔
3. فَإِيَّاكُمْ إِيَّاكُمْ: یہ عربی کا اسلوب ہے جو کسی آنے والے بڑے خطرے سے خبردار کرنے اور سختی سے روکنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
4. نُورُ الْإِيمَانِ: ایمان کی وہ روشنی جو دل کو برائی سے روکتی ہے۔ گناہ کے وقت یہ نور بجھ جاتا ہے یا دل سے نکل کر سر پر چھتری کی طرح معلق ہو جاتا ہے۔

تشریح:

اس اہم حدیث مبارکہ کی وضاحت میں علماء اور محدثین نے ایمان کی حقیقت اور گناہ کے اثرات پر بہت گہری بحث فرمائی ہے:

1. ایمان کی نفی کی حقیقت: محدثین فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایمان کی نفی سے مراد یہ نہیں کہ گناہ کرنے والا اسلام سے خارج ہو کر کافر ہو جاتا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ "کامل مومن" نہیں رہتا۔ گناہ کے اس منحوس لمحے میں اس کا اللہ سے تعلق اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ ایمان کا نور اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔

2. ایمان کا نکلنا اور واپس آنا: علماء کے نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انگلیوں کی مثال سے یہ واضح فرمایا کہ ایمان اور عمل کا ایک مضبوط جوڑ ہے۔ جب انسان بڑے گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ قلبی کیفیت (نورِ ایمان) جو اسے اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس دلاتی ہے، عارضی طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ توبہ کرنے سے وہ تعلق دوبارہ بحال ہو جاتا ہے۔

3. حساسیت اور غفلت: علماء فرماتے ہیں کہ ایک مومن کا دل نہایت حساس ہوتا ہے۔ گناہِ کبیرہ کے وقت وہ احساسِ بندگی سے خالی ہو جاتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے بار بار خبردار فرمایا کہ "بچو، بچو!" کیونکہ یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب انسان اپنی عاقبت داؤ پر لگا دیتا ہے۔

4. امام بخاری کی وضاحت: امام بخاری نے اس حدیث کی شرح میں واضح فرمایا کہ گناہ گار سے "نورِ ایمان" چھن جاتا ہے۔ یعنی اس کے پاس کلمہ تو باقی رہتا ہے لیکن وہ ایمان کی مٹھاس اور وہ خاص حفاظت کھو دیتا ہے جو اسے گناہوں سے بچاتی ہے۔

ان احادیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ گناہ کی حالت میں انسان کا ایمان کامل نہیں رہتا اور معصیت کی تاریکی اس کے دل سے ایمان کا نور وقتی طور پر چھین لیتی ہے۔ جب کوئی شخص زنا، چوری، شراب نوشی یا لوٹ مار جیسے قبیح افعال میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اس وقت ایمانِ کامل کی مٹھاس اور برکت سے محروم ہو چکا ہوتا ہے اور ایمان اس کے سر پر ایک سائبان کی طرح معلق ہو جاتا ہے۔ یہ ہمیں اس لرزہ خیز حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ گناہ انسان کو اللہ کے خاص تحفظ سے باہر نکال دیتا ہے، تاہم سچی توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے جو انسان کو گناہوں کی گندگی سے پاک کر کے دوبارہ ایمان کی حلاوت اور روشنی کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور علمی رہنمائی:

1. **لوٹ مار اور کرپشن:** حدیث میں ذکر کردہ "نُہبہ" (لوٹ مار) کی جدید شکلیں کرپشن، زمینوں پر قبضے اور عوامی اموال کی بے دردی سے لوٹ مار ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کلمہ پڑھ لینے کے بعد یہ سب "معمولی" ہے، جبکہ حدیث بتاتی ہے کہ ایسے کاموں کے وقت ایمان کا نور رخصت ہو جاتا ہے۔

2. **نشہ آور اشیاء کا فتنہ:** شراب کے ساتھ ساتھ آج کل کی جدید منشیات (ڈرگز) شیشہ اور آئس بھی اسی حکم میں ہیں۔ نشہ انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے اور جس لمحے وہ نشہ کرتا ہے، وہ اپنے خالق کی یاد سے غافل ہو کر اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

3. **خیانت اور دفتری معاملات:** سرکاری اموال یا دوسروں کی امانتوں میں خورد برد کو آج کل "ہوشیاری" سمجھا جاتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ خیانت کے وقت انسان کا یہ دعویٰ کہ "میرا دل صاف ہے" یا "میرا ایمان پکا ہے" جھوٹا پڑ جاتا ہے کیونکہ عمل ایمان کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔

4. **سوشل میڈیا اور کردار کشی:** دوسروں کی آبرو پر حملہ کرنا (ان تہیب) بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ ڈیجیٹل دنیا میں کسی کی عزت اچھالنا اور اسے تماشہ بنانا ایمان کی روح کے منافی ہے۔

خلاصہ درس:

1. بڑے گناہوں (زنا، چوری، شراب، قتل اور خیانت) کے ارتکاب کے وقت ایمان کا نور دل سے نکل جاتا ہے۔
2. گناہ گار شخص اسلام سے خارج تو نہیں ہوتا، لیکن اس کا ایمان ناقص اور انتہائی کمزور ہو جاتا ہے۔
3. سچی توبہ ایمان کے چھنے ہوئے نور کو دوبارہ واپس لانے کا واحد راستہ ہے۔
4. ایک مسلمان کو ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں گناہ کی لذت اسے ایمان کی دولت سے محروم نہ کر دے۔

درس نمبر: 29۔ حدیث نمبر: 56

موضوع: خالص منافق کی چار نشانیاں اور ان کا وبال

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ».

اردو ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ (چاروں) پائی جائیں وہ پکا (خالص) منافق ہے، اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی ہے جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے: (1) جب اسے امین بنایا جائے (امانت دی جائے) تو خیانت کرے، (2) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، (3) جب معاہدہ کرے تو دھوکہ دے، اور (4) جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ (یا حق سے انحراف) پر اتر آئے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. مُنَافِقًا خَالِصًا: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا عمل مکمل طور پر منافقوں جیسا ہو چکا ہو، اگرچہ وہ زبان سے کلمہ پڑھتا ہو۔
2. غَدَرَ: اس کا مطلب ہے کسی سے کیے گئے عہد یا معاہدے کو دھوکے سے توڑ دینا۔
3. فَجَرَ: اس کے معنی حق سے ہٹ جانے کے ہیں۔ جھگڑے کے وقت اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان حق بات تسلیم کرنے کے بجائے بدزبانی اور گالی گلوچ کے ذریعے اپنی بات منوانے کی کوشش کرے۔
4. يَدَعَهَا: یعنی اس بری عادت کو جڑ سے اکھاڑ کر توبہ کے ذریعے اسے ترک کر دینا۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں حضور ﷺ نے عملی نفاق کی سنگینی کو واضح فرمایا ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کی تشریح میں درج ذیل اہم نکات بیان فرمائے ہیں:

1. نفاق کی اقسام: علماء فرماتے ہیں کہ نفاق کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک نفاقِ اعتقادی (دل میں کفر چھپانا اور زبان سے اسلام کا دعویٰ کرنا) اور دوسرا نفاقِ عملی (اعمال و اخلاق کا منافقوں جیسا ہونا)۔ یہ حدیث نفاقِ عملی کے بارے میں ہے، جو انسان کے ایمان کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔

2. کردار کی اہمیت: محدثین کے نزدیک اسلام صرف چند عبادات کا نام نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کا نام ہے۔ اگر کسی میں یہ چاروں برائیاں جمع ہو جائیں تو اس کا اسلام محض ایک ظاہری ڈھانچہ رہ جاتا ہے، جس میں ایمان کی روح مفقود ہوتی ہے۔

3. مومن کی پہچان: علماء فرماتے ہیں کہ مومن کا دل آئینہ ہوتا ہے، وہ جھوٹ اور دھوکے سے پاک ہوتا ہے۔ جب انسان جھوٹ یا خیانت کا عادی بن جاتا ہے تو اس کے دل سے ایمان کا نور رخصت ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

4. جھگڑے میں رویہ: حضور ﷺ نے جھگڑے کے وقت بدزبانی کو منافق کی علامت قرار دیا کیونکہ غصے کے وقت انسان کی اصل حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مومن غصے اور جھگڑے کی حالت میں بھی اللہ سے ڈرتا ہے اور اپنی زبان کو قابو میں رکھتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ منافقت کی نشانیاں صرف عقیدے تک محدود نہیں بلکہ انسان کے روزمرہ کے معاملات، گفتگو اور اخلاقیات اس کے باطن کا اصل آئینہ دار ہوتے ہیں۔ امانت میں خیانت کرنا، بات کرتے ہوئے جھوٹ بولنا، عہد کر کے بے وفائی کرنا اور جھگڑے کے وقت حق سے ہٹ کر بدزبانی کرنا وہ مزموم صفات ہیں جو اگر کسی میں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق بن جاتا ہے۔ یہ حدیث ہمیں اپنے کردار کی تطہیر کی ترغیب دیتی ہے تاکہ ہم ان اخلاقی بیماریوں سے پاک ہو کر ایک سچے، کھرے اور قابلِ اعتماد مومن کی مثالی زندگی گزار سکیں جو قول اور فعل کے تضاد سے پاک ہو۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. کاروباری بدعہدی: آج کل کاروباری سودوں میں وعدہ خلافی اور دھوکہ دہی کو "ہوشیاری" سمجھا جاتا ہے۔ یہ حدیث ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ معاہدہ توڑنا (غدر) ایمان کے خلاف ہے۔

2. سیاسی اور سماجی جھوٹ: موجودہ دور میں سیاسی مقاصد یا ذاتی شہرت کے لیے جھوٹ بولنا ایک عام بات بن گئی ہے۔ علماء کے نزدیک کلام کی سچائی ایمان کی بنیاد ہے اور جھوٹ نفاق کی جڑ ہے۔

3. سوشل میڈیا پر جھگڑے: آج کل انٹرنیٹ پر بحث و تکرار کے دوران گالی گلوچ (فجر) عام ہے۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ اختلاف کی صورت میں بھی اخلاق کے دائرے میں رہنا ضروری ہے، ورنہ یہ نفاقِ عملی کی علامت بن جاتا ہے۔

4. امانت میں خیانت: امانت صرف رقم تک محدود نہیں بلکہ دفتری ذمہ داریاں، دوسروں کے راز اور قومی اموال بھی امانت ہیں۔ ان میں کوتاہی کرنا منافقانہ صفت ہے۔

خلاصہ درس:

1. جھوٹ، خیانت، بدعہدی اور بدزبانی وہ چار مہلک بیماریاں ہیں جو انسان کو "خالص منافق" بنا دیتی ہیں۔
2. ایمان کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ اپنے معاملات کو پاک صاف رکھا جائے۔
3. اگر کسی میں ان میں سے ایک بھی علامت پائی جائے تو اسے فوری طور پر توبہ اور اصلاح کرنی چاہیے تاکہ وہ نفاق کی فہرست سے نکل سکے۔
4. سچا مسلمان وہی ہے جس کی سچائی اور امانت داری پر معاشرے کو کامل اعتماد ہو۔

درس نمبر:30۔حدیث نمبر:58

موضوع:نو واضح نشانیاں اور حق کو پہچاننے کے باوجود عمل سے دوری

عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ: قَالَ يَهُودِيٌّ لِصَاحِبِهِ اذْهَبْ بِنَا إِلَى هَذَا النَّبِيِّ فَقَالَ صَاحِبُهُ لَا تَقُلْ نَبِيٌّ إِنَّهُ لَوْ سَمِعَكَ كَانَ لَهُ أَرْبَعَةُ أَعْيُنٍ فَأَتَيَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَسَأَلَاهُ عَنْ تِسْعِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَقَالَ لَهُمْ: «لَا تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوا وَلَا تَزْنُوا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا تَمْشُوا بِبَرِيءٍ إِلَى ذِي سُلْطَانٍ لِيَقْتُلَهُ وَلَا تَسْحَرُوا وَلَا تَأْكُلُوا الرِّبَا وَلَا تَقْذِفُوا مُحْصَنَةً وَلَا تُوَلُّوا الْفِرَارَ يَوْمَ الزَّحْفِ وَعَلَيْكُمْ خَاصَّةً الْيَهُودَ أَنْ لَا تَعْتَدُوا فِي السَّبْتِ» . قَالَ فَقَبَّلُوا يَدَهُ وَرِجْلَهُ فَقَالَا نَشْهَدُ أَنَّكَ نَبِيٌّ قَالَ «فَمَا يَمْنَعُكُمْ أَنْ تَتَّبِعُونِي؟» قَالُوا إِنَّ دَاوُدَ دَعَا رَبَّهُ أَنْ لَا يَزَالَ فِي ذُرِّيَّتِهِ نَبِيٌّ وَإِنَّا نَخَافُ إِنْ تَبِعْنَاكَ أَنْ تَقْتُلَنَا الْيَهُودُ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ)

اردو ترجمہ: حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا: "ہمیں اس نبی کے پاس لے چلو۔" اس کے ساتھی نے کہا: "انہیں 'نبی' نہ کہو، کیونکہ اگر انہوں نے یہ سن لیا تو ان کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی وہ بہت خوش ہوں گے)۔" پھر وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے نو واضح نشانیوں کے بارے میں سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

1. اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ 2. چوری نہ کرو۔ 3. زنا نہ کرو۔ 4. کسی ایسی جان کو ناحق قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ 5. کسی بے گناہ کو حکمران کے پاس (جھوٹے مقدمے میں) نہ لے جاؤ تاکہ وہ اسے قتل کر دے۔ 6. جادو نہ کرو۔ 7. سود نہ کھاؤ۔ 8. پاکدامن عورت پر تہمت نہ لگاؤ۔ 9. میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیر کر نہ بھاگو۔ 10. اور خاص طور پر اے یہودیوں! ہفتے کے دن (شکار کر کے) حد سے تجاوز نہ کرو۔ یہ سن کر انہوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں چومے اور کہا: "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً نبی ہیں۔" آپ ﷺ نے پوچھا: "پھر تمہیں میری پیروی کرنے سے کیا چیز روکتی ہے؟" انہوں نے جواب دیا: "حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ کوئی نبی رہے (اور آپ بنی اسرائیل سے نہیں ہیں)، اور ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم نے آپ کی پیروی کی تو یہودی ہمیں قتل کر دیں گے۔"

لغوی و علمی تحقیق:

1. أَرْبَعَةُ أَعْيُنٍ: یہ ایک عربی محاورہ ہے جس کا مطلب ہے "بہت زیادہ خوش ہونا"۔ یہودی کا مقصد یہ تھا کہ اگر ہم نے انہیں نبی تسلیم کر لیا تو وہ اپنی دعوت کی کامیابی پر بہت مسرور ہوں گے۔
2. تِسْعِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ: اس سے مراد وہ نو احکامات ہیں جو تورات میں بنی اسرائیل کو دیے گئے تھے۔ ان کا ذکر قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بھی آیا ہے۔
3. لَا تَعْتَدُوا فِي السَّبْتِ: ہفتے کے دن کی حرمت۔ یہودیوں کو اس دن مچھلیوں کے شکار سے روکا گیا تھا، لیکن انہوں نے حیلے بہانوں سے اس حکم کی نافرمانی کی تھی۔
4. قَبَّلُوا يَدَهُ وَرِجْلَهُ: ہاتھ اور پاؤں چومنا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعظیم کے لیے بزرگوں اور انبیاء کے ہاتھ پاؤں چومنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ سجدے کی حد تک نہ پہنچے۔

تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں علماء اور محدثین نے درج ذیل اہم نکات بیان فرمائے ہیں:

1. حضور ﷺ کی حقانیت: محدثین فرماتے ہیں کہ یہودیوں کا آپ ﷺ سے ان پوشیدہ احکامات کے بارے میں پوچھنا دراصل آپ ﷺ کا امتحان لینا تھا۔ آپ ﷺ کا وہی جواب دینا جو تورات کی اصل روح تھی، ان کے لیے آپ ﷺ کی نبوت کی واضح دلیل بن گیا۔

2. حق کو پہچاننا اور قبول کرنا: علماء کے نزدیک محض "جان لینا (انفارمیشن)" نجات کے لیے کافی نہیں ہے۔ ان یہودیوں نے زبان سے اقرار کیا اور احترام بھی کیا، لیکن اپنی ضد، قوم پرستی اور جان کے خوف کی وجہ سے ایمان نہیں لائے۔ یہی وہ 'عملی نفاق' اور کفر ہے جو انسان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

3. خوفِ خلق بمقابلہ خوفِ خدا: یہودیوں کا یہ عذر کہ "ہمیں اپنی برادری سے خطرہ ہے" بہت سے لوگوں کے لیے تنبیہ ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ جب حق واضح ہو جائے تو دنیاوی نقصانات کا ڈر اللہ کے حکم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

4. نو بڑے گناہ: اس حدیث میں ذکر کردہ گناہوں کو 'کبیرہ گناہ' کہا گیا ہے کیونکہ یہ معاشرے کے امن اور فرد کے ایمان کو براہِ راست نشانہ بناتے ہیں۔ ان میں جادو، سود اور تہمت تراشی جیسے امور شامل ہیں جو آج بھی معاشرتی ناسور بنے ہوئے ہیں۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اخلاقی حدود کی پاسداری ہر دور کے انبیاء کی بنیادی تعلیمات اور شریعتوں کا لازمی حصہ رہی ہے۔ شرک، چوری، زنا، ناحق قتل، جادو، سود اور تہمت تراشی جیسے جرائم کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے بچنے کو ایمان کی بنیادی شرائط میں ذکر فرمایا ہے۔ یہ پیراگراف ہمیں یہ بصیرت بھی عطا کرتا ہے کہ محض حق کو پہچان لینا کافی نہیں بلکہ اس پر عمل کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی مکمل اتباع کرنا ہی وہ واحد راستہ ہے جو انسان کو اللہ کے عذاب سے بچا کر دائمی نجات کا حقدار بناتا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. فرقہ واریت اور برادری ازم: آج کل بہت سے لوگ حق بات معلوم ہونے کے باوجود صرف اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ ان کی برادری یا فرقہ ناراض نہ ہو جائے۔ یہ وہی یہودی صفت ہے جس کا ذکر اس حدیث میں ہے کہ انہوں نے سچ پہچانا مگر اپنی قوم کے ڈر سے اسے قبول نہ کیا۔

2. مظلوم کی دادرسی: حدیث میں حکمرانوں کے پاس بے گناہ کو لے جانے سے روکا گیا ہے۔ آج کے دور میں جھوٹے پرچے کروانا اور بے گناہ لوگوں کو قانونی چارہ جوئی میں پھنسانا ایک عام بیماری بن چکی ہے۔ یہ اکبر الذنوب میں سے ہے۔

3. سودی لین دین کا وبال: آپ ﷺ نے یہودیوں کو خاص طور پر نویں حکم کے طور پر سود سے روکا تھا۔ آج ہماری معیشت سود کی بنیاد پر کھڑی ہے، جو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

4. مقدس ہستیوں کا احترام: یہودیوں کا آپ ﷺ کے ہاتھ پاؤں چومنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ آپ کی عظمت کے قائل تھے، مگر محض احترام (عشق اور محبت کے دعوے) نجات کے لیے کافی نہیں۔ اصل محبت اتباع اور پیروی میں ہے۔

خلاصہ درس:

1. ایمان کا تقاضا صرف حق کو جاننا نہیں بلکہ اس پر عمل کرنا اور اس کی پیروی کرنا بھی ہے۔
2. دنیا کا خوف یا جان و مال کا خطرہ اللہ کے سچے دین کو قبول کرنے میں عذر نہیں بن سکتا۔
3. شرک، جادو، سود اور کسی بے گناہ کو جھوٹے مقدمے میں پھنسانا ہلاک کر دینے والے گناہ ہیں۔
4. سچا مومن وہ ہے جو لوگوں کے ڈر کے بجائے اللہ کی رضا کو مقدم رکھتا ہے۔

باب الوسوسہ

درس نمبر:31۔حدیث نمبر:63

موضوع:دل کے وسوسوں کی معافی اور اللہ کی رحمت

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي مَا وَسْوَسَتْ بِهِ صُدُورُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهِ أَوْ تَتَكَلَّمْ». (متفق علیہ)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان وسوسوں اور خیالات کو معاف فرمادیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، جب تک کہ وہ ان پر عمل نہ کریں یا ان کو زبان پر نہ لائیں"۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1. تَجَاوَزَ: اس کا مادہ 'جواز' ہے، جس کا مطلب ہے در گزر کرنا، معاف کرنا یا پکڑ نہ کرنا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیمی کا اظہار ہے کہ وہ صرف ارادے پر سزا نہیں دیتا۔
2. وَسْوَسَتْ: یہ 'وسوسہ' سے ہے، جس کا مطلب ہے دل میں پیدا ہونے والا وہ خفی خیال یا آواز جو انسان کو کسی کام کی طرف مائل کرے، چاہے وہ نفس کی طرف سے ہو یا شیطان کی طرف سے۔
3. صُدُورُهَا: یہ 'صدر' کی جمع ہے جس کا معنی سینہ ہے، یہاں اس سے مراد دل اور باطن ہے۔
4. تَتَكَلَّمْ: کلام کرنا یا زبان سے نکالنا۔ یعنی جب تک خیال محض باطن تک محدود ہے، معاف ہے۔

تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں حضور ﷺ نے امتِ محمدیہ پر ہونے والے اللہ کے ایک خاص فضل کو بیان فرمایا ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کی شرح میں انسانی سوچ کے پانچ درجات بیان فرمائے ہیں جن کو سمجھنا بہت ضروری ہے:

1. ہاجس (پہلا درجہ): یہ وہ اچانک پیدا ہونے والا خیال ہے جو انسانی ارادے کے بغیر دل میں آجائے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس پر کوئی گرفت نہیں کیونکہ یہ انسان کے اختیار میں نہیں۔

2. خاطر (دوسرا درجہ): جب وہ خیال دل میں کچھ دیر ٹھہر جائے لیکن انسان اسے اہمیت نہ دے۔ یہ بھی معاف ہے۔

3. حدیثِ نفس (تیسرا درجہ): جب انسان کے دل میں اس برے خیال کو کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش شروع ہو جائے۔ محدثین کے نزدیک یہ درجہ بھی اس حدیث کے تحت معاف ہے کیونکہ ابھی پختہ ارادہ نہیں ہوا۔

4. ہمّ (چوتھا درجہ): جب نیکی یا بدی کی طرف رجحان پختہ ہونے لگے۔ اللہ کا فضل یہ ہے کہ اگر بندہ نیکی کا ارادہ کرے تو نیکی لکھ دی جاتی ہے، لیکن بدی کے ارادے پر اس وقت تک گناہ نہیں لکھا جاتا جب تک عمل نہ کر لے۔

5. عزم (پانچواں درجہ): جب انسان گناہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لے۔ بعض علماء کے نزدیک اس پختہ ارادے پر پکڑ ہو سکتی ہے، لیکن اکثر محدثین فرماتے ہیں کہ اللہ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ جب تک وہ گناہ عملاً ظاہر نہ ہو (زبان یا ہاتھ سے)، اللہ اسے معاف رکھتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے اور وہ صرف دل میں آنے والے برے خیالات پر گرفت نہیں فرماتا۔ یہ ہمیں نفسیاتی سکون فراہم کرتی ہے کہ جب تک ہم کسی برے خیال کو عمل کی شکل نہ دیں یا اسے زبان سے ادا نہ کریں، ہم اللہ کے ہاں گناہ گار نہیں ٹھہرتے۔ یہ ہمیں اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ ہم وسوسوں سے پریشان ہونے کے بجائے اپنے عمل کی اصلاح پر توجہ دیں اور اللہ کی دی ہوئی اس رخصت پر اس کا شکر ادا کریں۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1.ذہنی تناؤاور وسوسے: آج کے دور میں بہت سے لوگ "مذہبی وسوسوں"(OCD)کا شکار ہو کر پریشان رہتے ہیں کہ کہیں وہ دائرہ اسلام سے خارج تو نہیں ہو گئے۔ یہ حدیث ان کے لیے مرہم ہے کہ جب تک وہ ان برے خیالات کو زبان سے ادا نہیں کرتے یا ان پر عمل نہیں کرتے، ان کا ایمان سلامت ہے اور وہ اللہ کی رحمت کے سائے میں ہیں۔

2.خیالات کی پاکیزگی: اگرچہ وسوسہ معاف ہے، لیکن علماء فرماتے ہیں کہ انسان کو برے خیالات کی آبیاری نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ بار بار کا وسوسہ انسان کو عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ ہمیں اپنے ذہن کو مثبت اور دینی کاموں میں مشغول رکھنا چاہیے۔

3.ڈیجیٹل دور اور عمل: آج کل سوشل میڈیا پر گناہ کا ارادہ کرنا اور پھر اسے ٹائپ کر دینا (تحریر) کلام کے حکم میں آتا ہے۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ اپنے برے خیالات کو تحریر یا تقریر کی صورت نہ دیں تاکہ ہم معافی کے دائرے میں رہیں۔

4.اللہ کی صفتِ ستاری: یہ حدیث ہمیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ جب اللہ ہمارے باطنی عیوب اور گندے خیالات پر پردہ ڈال کر انہیں معاف فرما رہا ہے، تو ہمیں بھی دوسروں کے بارے میں بدگمانی اور ان کے پوشیدہ عیب تلاش کرنے سے بچنا چاہیے۔

خلاصہ درس:

1. انسانی دل میں آنے والے برے خیالات اور وسوسے اس وقت تک معاف ہیں جب تک وہ قول یا فعل کی صورت اختیار نہ کر لیں۔
2. امتِ محمدیہ پر اللہ کا یہ خاص احسان ہے کہ نیتِ بد پر فوری گرفت نہیں ہوتی۔
3. وسوسوں پر پریشان ہونے کے بجائے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہونا چاہیے۔
4. سچا مومن وہ ہے جو اپنے ارادوں کو گناہ میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی اللہ کے خوف سے روک لے۔

درس نمبر:32۔حدیث نمبر:64

موضوع:دل کے برے خیالات اور وسوسے ایمان کی علامت

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ نَاسٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَسَأَلُوهُ: إِنَّا نَجِدُ فِي أَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ أَحَدُنَا أَنْ يَتَكَلَّمَ بِهِ. قَالَ: «أَوَ قَدْ وَجَدْتُمُوهُ؟» قَالُوا: نَعَمْ. قَالَ: «ذَاكَ صَرِيحُ الْإِيمَانِ». (رواه مسلم)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کچھ صحابہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "ہم اپنے دلوں میں ایسی باتیں (خیالات) محسوس کرتے ہیں جن کا زبان پر لانا ہم میں سے ہر ایک کے لیے بہت بڑی اور ہولناک بات ہے (یعنی ہم انہیں بیان کرنے کی ہمت نہیں پاتے)۔" آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا واقعی تم ایسا محسوس کرتے ہو؟" انہوں نے عرض کیا: "جی ہاں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ تو واضح اور خالص ایمان ہے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. یَتَعَاظَمُ: اس کا مطلب ہے کسی بات کو بہت بڑا، سنگین یا ہولناک سمجھنا۔ صحابہ کرام کے لیے ان وسوسوں کی سنگینی اتنی زیادہ تھی کہ وہ انہیں زبان پر لانے کے بجائے جل کر کوئلہ ہو جانے کو ترجیح دیتے تھے۔
2. صَرِيحُ الْإِيمَانِ: اس سے مراد خالص اور واضح ایمان ہے۔ یہاں خود وسوسے کو ایمان نہیں کہا گیا، بلکہ ان وسوسوں پر ہونے والی بے چینی، انہیں کفر سمجھنا اور ان سے بچنے کی تڑپ کو ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ کی وضاحت میں علماءاور محدثین نے درج ذیل اہم نکات بیان فرمائے ہیں:

1. ایمان اور شیطان کا ٹکراؤ: محدثین فرماتے ہیں کہ شیطان اسی دل میں وسوسے ڈال کر حملہ آور ہوتا ہے جہاں ایمان کی دولت موجود ہو، چور ہمیشہ اسی گھر کا رخ کرتا ہے جہاں قیمتی سامان ہو؛ ویران یا خالی گھر میں وہ وقت ضائع نہیں کرتا۔

2. وسوسوں پر ناگواری ایمان کی دلیل: علماء کے نزدیک ان برے خیالات کا دل میں آنا اور ان پر شدید پریشان ہونا اس بات کی قطعی گواہی ہے کہ بندے کا دل اللہ کی محبت اور اس کی عظمت سے بھرا ہوا ہے۔ یہی وہ قلبی مدافعت ہے جسے حضور ﷺ نے "صریح ایمان" فرمایا۔

3. شیطان کی ناکامی کا اظہار: جب شیطان کسی مومن کو عملی طور پر گناہ پر آمادہ کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے، تو وہ آخری حربے کے طور پر اس کے دل میں شکوک و شبہات ڈالتا ہے تاکہ اسے ذہنی اذیت دے کر اللہ سے دور کر سکے۔

4. صحابہ کا خوفِ خدا: صحابہ کرام کا یہ سوال ان کی باطنی پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے دل کی دنیا کو بھی اتنا صاف رکھنا چاہتے تھے کہ ایک برا خیال بھی انہیں پہاڑ جتنا بھاری محسوس ہوتا تھا۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ دل میں برے خیالات کا آنا اور ان پر دل کا کڑھنا یا پریشان ہونا در حقیقت ایمان کی علامت ہے۔ صحابہ کرام ان خیالات سے اس لیے ڈرتے تھے کیونکہ ان کے دلوں میں اللہ کی عظمت رچی بسی تھی اور وہ کسی صورت اسے ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ وسوسوں سے خوفزدہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا ایمان بیدار ہے اور وہ شیطان کے حملوں کو محسوس کر رہا ہے، لہٰذا ایسے موقع پر مایوس ہونے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایمان کی بنیاد قائم ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. ذہنی تناؤ اور مایوسی: آج کے دور میں بہت سے لوگ ایسے شیطانی خیالات کی وجہ سے خود کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھنے لگتے ہیں اور شدید احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ حدیث ان کے لیے باعثِ سکون ہے کہ اگر وہ ان خیالات کو ناپسند کرتے ہیں تو ان کا ایمان محفوظ ہے

2. جدید فتنوں کا سامنا: آج میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے عقائد کے حوالے سے بہت سے وسوسے پھیلائے جاتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان خیالات پر توجہ دینے کے بجائے ذکرِ الٰہی اور علمِ دین میں مشغول رہیں تاکہ شیطان کے حملے ناکام ہو جائیں۔

3. وسوسوں کا علاج: جب بھی ایسا خیال آئے، تو فوراً "اعوذ باللہ" پڑھ کر اپنی توجہ کسی اور کام کی طرف پھیر دینی چاہیے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ان خیالات پر بحث کرنے یا ان کی تہہ میں جانے کے بجائے انہیں نظر انداز کرنا ہی بہترین حکمتِ عملی ہے۔

4. ظاہری اور باطنی پاکیزگی: جس طرح ہم اپنے لباس کو صاف رکھتے ہیں، اسی طرح ہمیں اپنے خیالات کی نگرانی بھی کرنی چاہیے، تاہم غیر اختیاری خیالات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

خلاصہ درس:

1. دل میں آنے والے برے خیالات پر پریشان ہونا اور انہیں برا سمجھنا ایمان کی مضبوطی کی علامت ہے۔
2. شیطان مومن کو ذہنی طور پر پریشان کرنے کے لیے وسوسوں کا سہارا لیتا ہے۔
3. جب تک ان خیالات کو زبان سے ادا نہ کیا جائے یا ان پر عمل نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ ان پر کوئی گرفت نہیں فرماتا۔
4. سچا مومن وہی ہے جو شیطانی وسوسوں کے مقابلے میں اللہ کی پناہ لیتا ہے اور اپنے یقین کو متزلزل نہیں ہونے دیتا۔

درس نمبر:34۔حدیث نمبر:65

موضوع: خالق کے بارے میں شیطانی وسوسوں کا نبوی علاج

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَأْتِي الشَّيْطَانُ أَحَدَكُمْ فَيَقُولُ: مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ حَتَّى يَقُولَ: مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ؟ فَإِذَا بَلَغَهُ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللَّهِ وَلْيَنْتَهِ». (متفق عليه)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "شیطان تم میں سے کسی کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے: اسے کس نے پیدا کیا؟ اسے کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ وہ پوچھتا ہے: تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟ پس جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو بندے کو چاہیے کہ وہ اللہ کی پناہ مانگے اور اس (خیال) کو وہیں ختم کر دے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. يَأْتِي الشَّيْطَانُ: اس سے مراد شیطان کا براہِ راست آنا نہیں بلکہ دل میں وسوسہ ڈالنا ہے، کیونکہ شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔
2. فَلْيَسْتَعِذْ بِاللَّهِ: اسے چاہیے کہ وہ "اعوذ باللہ" پڑھے۔ یہ شیطان کے وار کو ناکام بنانے کے لیے ایک مضبوط قلعہ ہے۔
3. وَلْيَنْتَهِ: اسے چاہیے کہ وہ رک جائے۔ یعنی اس وسوسے کو مزید طول نہ دے اور نہ ہی اس پر منطقی بحث کرنے کی کوشش کرے۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے انسانی ایمان پر ہونے والے سب سے بڑے حملے اور اس کے حل کی وضاحت فرمائی ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کے درج ذیل پہلو اجاگر کیے ہیں:

1. شیطان کا آخری حربہ: محدثین فرماتے ہیں کہ جب شیطان انسان کو گناہوں پر آمادہ کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے، تو وہ آخری کوشش کے طور پر عقیدے پر حملہ کرتا ہے۔ وہ انسان کی فطری تجسس کی حس کو غلط سمت میں موڑ کر اسے ایسے سوالات میں الجھا دیتا ہے جن کا عقلِ انسانی احاطہ نہیں کر سکتی۔

2. عقلِ انسانی کی حد: علماء کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات "اول" ہے، یعنی اس سے پہلے کچھ نہ تھا۔ یہ سوال کہ "خالق کو کس نے پیدا کیا" عقلی طور پر بھی باطل ہے، کیونکہ اگر خالق کا کوئی خالق ہو تو وہ خالق نہیں رہے گا، بلکہ اس کا پیدا کرنے والا معبود بن جائے گا۔

3. نبوی طریقہ علاج: آپ ﷺ نے اس وسوسے کا حل بحث و مباحثہ نہیں بلکہ "رک جانا" (ولینتہ) بتایا ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ وسوسے کی جڑ کاٹنے کا بہترین طریقہ اسے نظر انداز کرنا اور اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جانا ہے۔

4. ایمان کی حفاظت: علماء فرماتے ہیں کہ ایسا وسوسہ آنے پر پریشان ہونا اس بات کی علامت ہے کہ دل میں ایمان موجود ہے، اسی لیے شیطان اسے چوری کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لیے انتہائی حد تک جاتا ہے اور خالق کے بارے میں بھی شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ہمیں اس نبوی حکمت سے آگاہ کرتی ہے کہ ایسے موقع پر عقل کے گھوڑے دوڑانے اور بحث و مباحثہ کرنے کے بجائے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور ان خیالات کو فوری طور پر ترک کر دینا چاہیے۔ یہ پیراگراف ہمیں ذہنی الجھنوں سے بچنے اور اللہ کی معرفت میں استقامت اختیار کرنے کا وہ عملی طریقہ سکھاتا ہے جو ہمیں شیطانی فریب سے بچا کر ایمان کی سلامتی فراہم کرتا۔

موجودہ دور کے مسائل اور علمی رہنمائی:

1.جدید ملحدانہ افکار: آج کل انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر الحاد (Atheism) کی لہر ایسے ہی سوالات سے شروع ہوتی ہے۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ ایسے سوالات پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے ایمان کی تجدید کرنی چاہیے۔

2.ذہنی یکسوئی: آج کے دور میں لوگ فضول سوچوں کی وجہ سے ذہنی تناؤ کا شکار رہتے ہیں۔ "ولینتہ" (رک جاؤ) کا حکم نفسیاتی طور پر بھی بہترین مشورہ ہے کہ جب دماغ کسی مہلک سمت میں چلے تو اسے زبردستی روک دیا جائے۔

3.ذکرِ الٰہی کی اہمیت: شیطان جب وسوسہ ڈالے تو اس کا مقابلہ صرف انسانی عقل سے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے خالقِ کائنات کی پناہ (استعاذہ) ضروری ہے۔

4.بچوں کی تربیت: والدین کو چاہیے کہ جب بچے ایسے عجیب سوالات کریں تو انہیں ڈانٹنے کے بجائے پیار سے سمجھائیں کہ ہماری عقل ہر چیز کو نہیں سمجھ سکتی اور ہمیں اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

خلاصہ درس:

1. شیطان انسان کو کفر تک پہنچانے کے لیے اللہ کی ذات کے بارے میں لایعنی سوالات دل میں ڈالتا ہے۔
2. وسوسہ آنے پر فوری طور پر "اعوذ باللہ" پڑھ کر اللہ کی پناہ مانگنا سنت ہے۔
3. ایمان کی سلامتی اسی میں ہے کہ شیطانی خیالات کو ذہن میں پروان نہ چڑھنے دیا جائے بلکہ انہیں فوراً جھٹک دیا جائے۔
4. اللہ کی ذات واجب الوجود ہے، وہی سب کا خالق ہے اور اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔

درس نمبر:35۔حدیث نمبر:67

موضوع: ہر انسان کے ہمزاد (فرشتہ اور جن) کی حقیقت

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهِ قَرِينُهُ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِينُهُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ». قَالُوا: وَإِيَّاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: «وَإِيَّايَ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِخَيْرٍ». (رواہ مسلم)

اردو ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ ایک جن (شیطان) اور ایک فرشتہ (بطور ساتھی) مقرر نہ کر دیا گیا ہو"۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں، میرے ساتھ بھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس (جن) کے مقابلے میں میری مدد فرمائی، پس وہ مطیع (مسلمان) ہو گیا، اب وہ مجھے نیکی کے سوا کسی بات کا حکم نہیں دیتا"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. قَرِیْنُہ: اس کا لغوی معنی 'ساتھ رہنے والا' یا 'ہمزاد' ہے۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ باطنی قوتیں ہیں جو ہر وقت انسان کے ساتھ رہ کر اسے مختلف کاموں پر اکساتی ہیں۔
2. وُکِّلَ بِہٖ: یعنی اللہ کی طرف سے اس پر مامور یا مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہ تقرری انسان کی آزمائش کے لیے ہے تاکہ دیکھا جائے کہ وہ فرشتے کی الہامی آواز سنتا ہے یا شیطان کا وسوسہ۔
3. فَاَسْلَمَ: علماء نے اس کے دو معنی بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شیطان 'مسلمان' ہو گیا، اور دوسرا یہ کہ 'میں اس کے شر سے سلامت رہا'۔ نبی کریم ﷺ کی شانِ اقدس کے مطابق پہلا معنی زیادہ موزوں ہے کہ وہ آپ ﷺ کا ایسا مطیع ہوا کہ صرف خیر کی بات ہی کرنے لگا۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ کی وضاحت میں علماء اور محدثین نے انسانی باطن کی کشمکش اور نبوی خصوصیت پر تفصیلی بحث فرمائی ہے:

1. انسان کا دوہرا باطنی نظام: محدثین فرماتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں دو طرح کی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ ایک خیر کی طرف جسے فرشتہ ابھارتا ہے، اسے 'الہام' کہتے ہیں۔ دوسری شر کی طرف جسے جن (شیطان) ابھارتا ہے، اسے 'وسوسہ' کہا جاتا ہے۔ یہ کشمکش موت تک جاری رہتی ہے۔

2. قرینِ ملائکہ (فرشتہ): علماء کے نزدیک یہ فرشتہ بندے کو سچائی کی تصدیق اور نیکی پر ثابت قدمی کی دعوت دیتا ہے۔ جب انسان کسی نیک کام کا ارادہ کرتا ہے تو درحقیقت وہ اس فرشتے کی آواز ہوتی ہے۔

3. قرینِ جن (شیطان): اس کا کام انسان کو برائی کی طرف بلانا اور حق کی تکذیب کرنا ہے۔ محدثین کی رائے میں یہ وہی شیطان ہے جو انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے تاکہ اسے اللہ سے دور کر سکے۔

4. نبی کریم ﷺ کی امتیازی شان: صحابہ کا سوال "وایاک؟" (کیا آپ کے ساتھ بھی؟) ان کی حیرت کو ظاہر کرتا تھا۔ آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ اللہ کی مدد سے آپ ﷺ کا شیطان مکمل طور پر مغلوب ہو گیا۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کا معجزہ ہے کہ آپ کا باطن مکمل طور پر نورانی ہے اور وہاں شر کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ خیر اور شر کی دو مستقل قوتیں لگی ہوئی ہیں؛ فرشتہ جو نیکی کی تحریک پیدا کرتا ہے اور شیطان جو برائی کے وسوسے ڈالتا ہے۔ یہ ہمیں ہر لمحہ بیدار رہنے کی دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنے دل میں اٹھنے والے خیالات کو پرکھیں اور صرف ان کی پیروی کریں جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہوں۔ نبی کریم ﷺ کا اپنے بارے میں یہ بتانا کہ اللہ نے ان کے ہمزاد (شیطان) کو مطیع کر دیا تھا، آپ ﷺ کے بلند مقام کی دلیل ہے، جبکہ ہمارے لیے اس میں یہ ہدایت ہے کہ ہم مسلسل اللہ سے مدد مانگیں تاکہ خیر کی قوت شر پر غالب رہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. نفسیاتی الجھنیں اور وسوسے: آج کے دور میں بہت سے لوگ اپنے ذہن میں اٹھنے والے برے خیالات سے پریشان ہو کر اسے ذہنی بیماری سمجھ لیتے ہیں۔ یہ حدیث سکھاتی ہے کہ برے خیالات کا آنا فطری ہے (وسوسہ)، اہم بات یہ ہے کہ انسان ان کے بجائے فرشتے کی دی ہوئی خیر کی دعوت پر کان دھرے۔

2. ضمیر کی آواز (The Inner Voice): جسے جدید دنیا میں 'ضمیر' کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت وہی قرینِ ملائکہ ہے جو ہمیں غلط کام پر ٹوکتا ہے۔ ہمیں اپنے باطن کو اتنا صاف رکھنا چاہیے کہ ہم فرشتے کی رہنمائی کو واضح طور پر محسوس کر سکیں۔

3. کامیابی کا راز: انسانی زندگی کی کامیابی اس بات میں ہے کہ وہ اپنے شیطانی ساتھی کو اللہ کے ذکر اور نیکی کے ذریعے مغلوب کر دے۔ اگر ہم نیکیوں میں مشغول رہیں گے تو شیطان کمزور پڑ جائے گا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا شیطان خیر کا پابند ہو گیا۔

4. خود احتسابی: ہمیں روزانہ یہ دیکھنا چاہیے کہ آج ہم پر کس کا اثر زیادہ رہا؟ کیا ہم نے فرشتے کی آواز سن کر کسی کی مدد کی یا شیطان کی سن کر جھوٹ یا غیبت کا سہارا لیا؟

خلاصہ درس:

1. ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ نیکی کے لیے اور ایک جن برائی کے لیے مقرر ہے۔
2. فرشتے کی تحریک کو الہام اور شیطان کی تحریک کو وسوسہ کہا جاتا ہے۔
3. نبی کریم ﷺ کا شیطان اللہ کی مدد سے مطیع ہو کر نیکی کا پیغام دینے لگا۔
4. مومن کو چاہیے کہ وہ ذکر و فکر کے ذریعے فرشتے کی آواز کو طاقتور اور شیطان کے وار کو ناکام بنائے۔

درس نمبر:36۔حدیث نمبر:68

موضوع: شیطان کی انسانی وجود میں رسائی اور ہمہ وقت بیداری کی ضرورت

وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الانسان مجْرى الدَّم». (متفق عليه)

اردو ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بے شک شیطان انسان کے وجود میں خون کی طرح دوڑتا ہے"۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1. يَجْرِي: اس کا مطلب ہے 'رواں ہونا' یا 'دوڑنا'۔ جس طرح خون شریانوں میں مسلسل حرکت کرتا ہے، اسی طرح شیطان کی تاثیر بھی انسان کے اندر رواں دواں ہے۔

2. مَجْرَى الدَّم: خون کے دوڑنے کی جگہ یا راستہ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی وجود کا کوئی بھی حصہ شیطان کے وسوسوں سے محفوظ نہیں ہے، کیونکہ خون جسم کے ہر خلیے تک پہنچتا ہے۔

تشریح:

اس مختصر مگر نہایت جامع حدیث مبارکہ میں اللہ کے رسول ﷺ نے شیطان کی طاقت اور اس کے حملے کی نوعیت کو ایک ایسی مثال سے واضح فرمایا ہے جسے ہر انسان آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کی شرح میں درج ذیل پہلو بیان فرمائے ہیں:

1. وسوسہ اندازی کی غیر معمولی قدرت: محدثین فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ انسان کے باطن تک رسائی حاصل کر سکے۔ وہ انسانی جذبات، خیالات اور ارادوں پر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ انسان کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ خیال شیطان کی طرف سے آ رہا ہے یا اس کے اپنے نفس کی طرف سے۔

2. قربت اور ہمہ وقتی موجودگی: جس طرح خون انسان سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہیں ہوتا اور زندگی کی بقا کے لیے ہر وقت گردش میں رہتا ہے، اسی طرح شیطان بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ وہ انسان کے ہر عمل، ہر سوچ اور ہر فیصلے میں دخل اندازی کی کوشش کرتا ہے۔

3. پوشیدہ دشمن: خون جسم کے اندر ہوتا ہے اور نظر نہیں آتا، بالکل اسی طرح شیطان کا حملہ بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ سامنے سے آ کر وار کرنے کے بجائے خاموشی سے دل و دماغ میں زہر گھولتا ہے۔

4. حقیقت یا تمثیل؟ علماء کے درمیان اس پر بحث ہوئی ہے کہ کیا شیطان واقعی خون میں شامل ہو کر دوڑتا ہے یا یہ صرف ایک مثال ہے۔ اکثر محدثین کی رائے ہے کہ اسے تمثیل پر محمول کیا جائے گا، یعنی شیطان کو انسان پر اس قدر قدرت اور رسائی حاصل ہے جیسے خون کو پورے جسم پر ہوتی ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ شیطان انسان کو گمراہ کرنے کی غیر معمولی طاقت رکھتا ہے اور وہ انسانی وجود کے اندر اس طرح نفوذ کر جاتا ہے جیسے خون رگوں میں گردش کرتا ہے۔ یہ ہمیں اس لرزہ خیز حقیقت سے باخبر کرتی ہے کہ دشمن کہیں باہر نہیں بلکہ ہمارے اپنے نفس کے اندر گھات لگا کر بیٹھا ہے، اس لیے ہمیں اپنی ناجائز خواہشات اور غصے پر کڑی نظر رکھنی چاہیے کیونکہ یہی وہ راستے ہیں جہاں سے شیطان انسانی فطرت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا واحد حل اللہ کا ذکر اور ہر وقت اس کی پناہ میں رہنا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1.اچانک اٹھنے والے برے جذبات: کبھی کبھی انسان کے دل میں اچانک شدید غصہ، نفرت یا کسی گناہ کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ یہ "خون کی گردش" میں شامل شیطانی اثر ہو سکتا ہے۔ ایسے میں فوراً "اعوذ باللہ" پڑھ کر اپنی کیفیت کو تبدیل کرنا چاہیے۔

2.نفسیاتی غفلت: آج کے دور میں ہم گناہوں کو صرف سماجی برائی یا نفسیاتی مسئلہ سمجھتے ہیں، جبکہ یہ حدیث یاد دلاتی ہے کہ ہمارے پیچھے ایک باقاعدہ دشمن لگا ہوا ہے جو ہمارے وجود کے اندر تک رسائی رکھتا ہے۔ ہمیں اپنی روحانی صحت کے لیے ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے۔

3.ذکرِ الٰہی کی ڈھال: علماء فرماتے ہیں کہ جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان مغلوب ہو جاتا ہے اور اس کا راستہ رک جاتا ہے۔ جس طرح خون کی نالیوں میں رکاوٹ جسم کو بیمار کر دیتی ہے، ذکرِ الٰہی شیطان کے اثرات کے لیے "بلاک" (Block) کا کام کرتا ہے اور اسے اثر انداز ہونے سے روکتا ہے۔

4.کھانے پینے کے آداب: شیطان کے خون میں دوڑنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ حرام لقمے کے ذریعے انسان کے اندر زیادہ اثر پیدا کرتا ہے۔ حلال رزق اور مسنون دعائیں شیطان کی اس رسائی کو محدود کر دیتی ہیں۔

خلاصہ درس:

1. شیطان انسان کے باطن اور خیالات تک مکمل رسائی رکھتا ہے۔
2. اس کے حملے اتنے باریک اور پوشیدہ ہوتے ہیں جیسے رگوں میں دوڑتا ہوا خون۔
3. انسان کو ایک لمحے کے لیے بھی اس دشمن سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔
4. شیطان کے اس ہمہ وقت حملے کا مقابلہ صرف اللہ کی پناہ مانگنے اور ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنے سے ہی ممکن ہے۔

درس نمبر:37۔حدیث نمبر:71

موضوع:ابلیس کا تخت،اس کا لشکر اور بدترین فتنہ

وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ إِبْلِيسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً يَجِيءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُولُ: فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا فَيَقُولُ: مَا صَنَعْتَ شَيْئًا قَالَ ثُمَّ يَجِيءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُولُ: مَا تَرَكْتُهُ حَتَّى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهِ قَالَ فَيُدْنِيهِ مِنْهُ وَيَقُولُ: نَعَمْ أَنْتَ» قَالَ الْأَعْمَشُ أُرَاهُ قَالَ: «فَيَلْتَزِمُهُ» (رواہ مسلم)

اردو ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بے شک ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے، پھر (لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے) اپنے لشکر بھیجتا ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ شیطان ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ کھڑا کرتا ہے۔ ان میں سے ایک آکر کہتا ہے: میں نے فلاں فلاں کام کیا ہے۔ ابلیس کہتا ہے: تو نے کچھ نہیں کیا۔ پھر دوسرا آکر کہتا ہے: میں نے (فلاں شخص کو) نہیں چھوڑا یہاں تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی۔ (یہ سن کر) ابلیس اسے اپنے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے: ہاں! تو نے (بڑا کام) کیا ہے۔" امام اعمش (راوی) فرماتے ہیں کہ غالباً آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "پھر ابلیس اسے گلے لگا لیتا ہے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. عَرْشَهُ: تخت۔ ابلیس پانی پر اپنا تخت بچھا کر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی نقالی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
2. سَرَايَاهُ: یہ 'سریہ' کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے لشکری دستے۔ ابلیس کے پاس باقاعدہ منظم گروہ ہیں جو مختلف گناہوں پر مامور ہیں۔
3. أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً: جو سب سے بڑا فتنہ یا آزمائش پیدا کرے۔ ابلیس کے ہاں ترقی کا معیار گناہ کی سنگینی اور معاشرتی بگاڑ ہے۔

4. فَيَلْتَزِمُهُ: اسے سینے سے لگالیتا ہے یا اس کا گلے ملتا ہے۔ یہ اس شیطان کی حوصلہ افزائی کا طریقہ ہے۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں اللہ کے رسول ﷺ نے شیطانی نظام کی کمرشل اور معاشرتی تباہ کاریوں کو بے نقاب فرمایا ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کے درج ذیل اہم نکات بیان کیے ہیں:

1. منظم شیطانی نیٹ ورک: ابلیس محض ایک خیال نہیں بلکہ ایک منظم نظام کا سربراہ ہے جو انسانوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے کے لیے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ اپنے کارندوں سے روزانہ کی کارکردگی کی رپورٹ لیتا ہے۔

2. خاندانی نظام کی اہمیت: ابلیس کے نزدیک چوری، جھوٹ یا دیگر انفرادی گناہ اتنے بڑے نہیں جتنا بڑا میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ جب ایک گھر ٹوٹتا ہے تو صرف دو انسان الگ نہیں ہوتے بلکہ پورا خاندانی نظام تباہ ہو جاتا ہے۔

3. جدائی کے خطرناک نتائج: محدثین نے وضاحت فرمائی ہے کہ میاں بیوی کی جدائی کے بعد زنا کے دروازے کھلتے ہیں، بچوں کی تربیت برباد ہو جاتی ہے اور وہ معاشرے میں مجرم بن کر ابھرتے ہیں۔ یوں ایک طلاق پورے معاشرے میں کئی نئے فتنوں کا سبب بنتی ہے، اسی لیے ابلیس اس کارنامے پر شیطان کو گلے لگاتا ہے۔

4. ابلیس کی نقالی: ابلیس کا تخت پانی پر ہونا اس کی تکبر کی علامت ہے، وہ کائنات کے نظام میں دخل اندازی کر کے انسانوں کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ وہی اصل طاقت ہے، جبکہ اصل قدرت صرف اللہ کے پاس ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ شیطان کا سب سے بڑا ہدف انسانی معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی خاندانی نظام کو تباہ کرنا ہے۔ ابلیس کے نزدیک سب سے کامیاب وہ چیلہ ہے جو میاں بیوی کے درمیان نفرت اور جدائی پیدا کر دے، کیونکہ ایک گھر کے ٹوٹنے سے پوری نسل اور معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ ہم اپنے گھریلو جھگڑوں اور غلط فہمیوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کریں، بلکہ انہیں شیطانی چال جان کر صبر اور عفو و درگزر سے کام لیں تاکہ ابلیس کے اس مذموم مقصد کو ناکام بنایا جا سکے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح: آج کل معمولی باتوں پر میاں بیوی میں جھگڑا اور طلاق عام ہو گئی ہے۔ یہ حدیث ہمیں خبردار کرتی ہے کہ جب بھی میاں بیوی میں بلاوجہ رنجش پیدا ہو، تو سمجھ لیں کہ یہ شیطان کا خاص حملہ ہے تاکہ وہ ابلیس سے انعام حاصل کر سکے۔

2. رشتوں میں صبر و تحمل: علماء کے نزدیک گھر بچانے کے لیے صبر کرنا جہاد کے برابر ہے۔ میاں بیوی کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی کوتاہیوں کو نظر انداز کریں تاکہ شیطانی لشکر ناکام ہو جائے۔

3. سوشل میڈیا اور خانگی فتنے: آج کل انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان شکوک و شبہات پیدا کرنا ابلیس کا آسان ہتھیار بن گیا ہے۔ ہمیں اپنے نجی معاملات کو دوسروں (اور خاص کر سوشل میڈیا) سے محفوظ رکھنا چاہیے۔

4. خیر خواہوں کا کردار: اگر کسی جوڑے میں ان بن ہو جائے تو رشتہ داروں کو صلح کی کوشش کرنی چاہیے، نہ کہ آگ پر تیل ڈالنا چاہیے۔ آگ لگانے والا شیطان کا ساتھی ہے اور صلح کروانے والا رحمن کا پسندیدہ بندہ ہے۔

خلاصہ درس:

1. ابلیس انسانی معاشرے کو جڑوں سے کھوکھلا کرنے کے لیے خاندانی نظام پر حملہ کرتا ہے۔
2. میاں بیوی میں جدائی ڈالنا ابلیس کا سب سے بڑا اور پسندیدہ فتنہ ہے۔
3. مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے گھریلو معاملات میں شیطان کو دخل اندازی کا موقع نہ دیں اور صلح و آشتی کو مقدم رکھیں۔

4.ایک گھر کا بچ جانا در حقیقت ابلیس کی شکست اور اللہ کی رحمت کی جیت ہے۔

درس نمبر:38۔حدیث نمبر:72

موضوع: شیطانی سازش کا نیا رخ: مسلمانوں میں باہمی اختلاف اور فتنہ وفساد

وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّونَ فِي جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَلَكِنَّ فِي التَّحْرِيشِ بَيْنَهُمْ»۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

اردو ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "بے شک شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ جزیرہ نما عرب میں نماز پڑھنے والے اس کی عبادت کریں گے، لیکن وہ (اس بات سے مایوس نہیں ہوا کہ) ان کے درمیان پھوٹ اور لڑائی جھگڑے ڈلوائے"۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1.أَيِسَ: اس کا مطلب ہے 'مایوس ہو جانا'۔اللہ کے رسول ﷺ نے پیشگوئی فرمائی کہ اب عرب کی سرزمین سے بت پرستی کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہے۔

2.الْمُصَلُّونَ: یہاں نماز پڑھنے والوں سے مراد وہ کامل مومنین ہیں جو توحید پر پختہ ہیں۔

3.التَّحْرِيشِ: اس کا لغوی معنی ہے 'اکسانا' یا 'لڑانا'۔جس طرح شکاری جانوروں کو آپس میں لڑایا جاتا ہے، اسی طرح شیطان مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتا ہے تاکہ ان کی قوت ختم ہو جائے۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں حضور ﷺ نے امت کو ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ فرمایا ہے۔علماء اور محدثین نے اس کے درج ذیل اہم پہلو بیان فرمائے ہیں:

1.توحید کا غلبہ: محدثین فرماتے ہیں کہ اسلام نے جزیرہ عرب میں شرک کی جڑوں کو اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ اب شیطان کو یہ امید نہیں رہی کہ وہ یہاں کے مسلمانوں سے دوبارہ بت پرستی کروا سکے گا۔یہ دینِ اسلام کی حقانیت اور مضبوطی کی علامت ہے۔

2.شیطان کا متبادل منصوبہ: جب شیطان انسان کو بڑے کفر (شرک) میں مبتلا کرنے سے عاجز آ جاتا ہے، تو وہ اسے 'عملی نفاق' اور باہمی نفرتوں میں الجھا دیتا ہے۔اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی توانائیاں اللہ کی عبادت اور دین کی ترویج کے بجائے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں ضائع کریں۔

3.تحریش (باہمی اشتعال): علماء کے نزدیک 'تحریش' کا مطلب یہ ہے کہ شیطان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا بنا کر پیش کرتا ہے۔وہ بھائی کو بھائی سے، پڑوسی کو پڑوسی سے اور ایک مسلک کے ماننے والے کو دوسرے سے بدظن کرتا ہے تاکہ ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے۔

4.نماز اور اتحاد کا تعلق: حدیث میں 'نماز پڑھنے والوں' کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔اس کا اشارہ یہ ہے کہ جو لوگ بظاہر عبادت گزار ہیں، شیطان ان کے دلوں میں بھی حسد، بغض اور کینہ ڈال کر انہیں باہمی فساد میں مبتلا کر سکتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ جزیرہ نما عرب میں اسلام کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ شیطان وہاں دوبارہ بت پرستی رائج کرنے سے مایوس ہو چکا ہے، لیکن اس نے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے اور تفرقہ ڈالنے کی امید نہیں چھوڑی۔وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ

مسلمانوں کے درمیان اختلافات، حسد اور رنجشیں پیدا کرے۔ یہ پیراگراف ہمیں یہ بصیرت عطا کرتا ہے کہ ہم اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھیں اور کسی بھی ایسی بات سے بچیں جو باہمی دوری کا سبب بنے، کیونکہ تفرقہ بازی دراصل شیطان کی آخری اور سب سے خطرناک چال ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. **فرقہ واریت کا فتنہ:** آج مسلمانوں میں جو فرقہ وارانہ نفرتیں پائی جاتی ہیں، وہ درحقیقت اسی شیطانی 'تحریش' کا نتیجہ ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ فروعی اختلافات کو دشمنی کی بنیاد نہ بنائیں اور 'امتِ واحدہ' کی صورت میں متحد رہیں۔
2. **سوشل میڈیا اور غلط فہمیاں:** آج کے دور میں شیطان انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا کام لے رہا ہے۔ کسی بھی خبر کی تصدیق کے بغیر اسے پھیلانا شیطانی ایجنڈے کو تقویت دینا ہے۔
3. **خاندانی اور کاروباری جھگڑے:** معمولی جائیداد، لین دین یا انا کی خاطر برسوں کے تعلقات توڑ دینا شیطان کی کامیابی ہے۔ ہمیں عفو و درگزر سے کام لے کر شیطان کو ناکام بنانا چاہیے۔
4. **اتحاد کی ضرورت:** مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا سب سے بڑا سبب آپس کی نااتفاقی ہے۔ اگر ہم اس حدیث کی روشنی میں اپنے رویوں کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم غیروں سے زیادہ اپنوں سے لڑ کر کمزور ہو رہے ہیں۔

خلاصہ درس:

1. جزیرہ عرب اور عمومی طور پر امتِ مسلمہ میں شرکِ جلی کا امکان ختم ہو چکا ہے، لیکن باہمی پھوٹ کا خطرہ ہر وقت موجود ہے۔
2. مسلمانوں کو آپس میں لڑانا ابلیس کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔
3. عبادت گزار ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان شیطان کے مکر سے محفوظ ہو گیا ہے؛ اسے اپنے اخلاق اور باہمی معاملات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔
4. سچا مومن وہی ہے جو اشتعال انگیزی کے وقت صبر کرے اور مسلمانوں کے درمیان صلح و اتحاد کی کوشش کرے۔

باب تقدیر پر ایمان

درس نمبر: 39۔ حدیث نمبر: 79

موضوع: تقدیر کا الٰہی فیصلہ اور تخلیقِ کائنات کا پس منظر

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كَتَبَ اللَّهُ مَقَادِيرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ» قَالَ: «وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ»۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

اردو ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں، اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. مَقَادِيرَ: یہ 'مقدار' کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے وہ خاص پیمانے یا فیصلے جو اللہ نے ہر چیز کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔
2. كَتَبَ: اس کا لغوی معنی 'لکھنا' ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جسم اور مادی اعضاء سے پاک ہے، اس لیے یہاں لکھنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے قلم کو حکم دیا یا فرشتوں کے ذریعے لوحِ محفوظ پر اسے درج کروایا۔

3. خَمْسِينَ اَلْفَ سَنَةٍ: پچاس ہزار سال۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ایک طویل مدت ہے جو انسانی عقل کے مطابق بیان کی گئی ہے، ورنہ اللہ کی نظر میں وقت کی حقیقت مختلف ہے۔

4. عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ: اس کا مطلب ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے پوری کائنات میں پانی کا وجود تھا جو ہوا پر ٹھہرا ہوا تھا اور اللہ کا عرش اس پانی پر تھا۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں علماء اور محدثین نے ایمان بالقدر (تقدیر پر ایمان) کے حوالے سے درج ذیل اہم نکات بیان کیے ہیں:

1. اللہ کا ازلی علم: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے، وہ اللہ کے علم میں پہلے سے موجود تھا۔ اللہ نے کسی بھی چیز کو پیدا کرنے سے پہلے اس کی زندگی، موت، رزق اور اعمال کا فیصلہ فرما دیا تھا۔

2. تقدیر پر ایمان کی فرضیت: علماء فرماتے ہیں کہ تقدیر پر ایمان لانا ایمان کے بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ خیر اور شر سب اللہ کی طرف سے ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔

3. تخلیق کا آغاز: حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مادی کائنات (آسمان و زمین) کی تخلیق سے پہلے بھی اللہ کی دیگر مخلوقات (پانی، عرش اور قلم) موجود تھیں۔ یہ اللہ کی عظمت اور اس کی خالقیت کی ایک عظیم جھلک ہے۔

4. لکھنے کی حکمت: اللہ کو اپنی یادداشت کے لیے لکھنے کی ضرورت نہیں، لیکن لوحِ محفوظ پر لکھوانے کی حکمت یہ ہے کہ فرشتے اس سے آگاہ ہو جائیں اور اللہ کی تدبیر کی عظمت مخلوق پر ظاہر ہو۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی اور اس کے اٹل فیصلے کے مطابق متحرک ہے۔ آسمان و زمین کی تخلیق سے بھی پچاس ہزار سال پہلے تمام مخلوقات کی تقدیر کا لکھا جانا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا علم مادی حدود سے کہیں بلند ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ایک سچے مومن کو ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ زندگی میں آنے والا ہر موڑ اللہ کے ایک عظیم منصوبے کا حصہ ہے۔ یہ پیراگراف ہمیں یہ بصیرت عطا کرتا ہے کہ ہم ظاہری اسباب کے بجائے اللہ کے فیصلے پر بھروسہ کریں، جس سے دل میں حقیقی توکل اور سکون پیدا ہوتا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. ذہنی اضطراب اور تقدیر: آج کے دور میں انسان اپنی ناکامیوں یا پریشانیوں پر بہت جلد ہمت ہار جاتا ہے اور ٹینشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ جو کچھ پیش آیا وہ پچاس ہزار سال پہلے لکھا جا چکا تھا، اس لیے مومن کو "کاش ایسا ہو جاتا" کہنے کے بجائے اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے۔

2. تدبیر اور تقدیر کا توازن: علماء فرماتے ہیں کہ تقدیر کا لکھا ہونا انسان کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کا لائسنس نہیں دیتا۔ اللہ نے انسان کو عقل اور اختیار دیا ہے تاکہ وہ کوشش کرے۔ ہماری ذمہ داری کوشش کرنا ہے، جبکہ نتیجہ تقدیر کے مطابق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

3. رزق کی فکر: جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ ہمارا رزق زمین و آسمان بننے سے بھی پہلے طے ہو چکا ہے، تو ہمیں رزق کے لیے غیر شرعی طریقے اپنانے یا حد سے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔

4. عقلی موشگافیوں سے بچنا: تقدیر اللہ کا ایک چھپا ہوا راز ہے۔ محدثین نصیحت فرماتے ہیں کہ تقدیر کے معاملے میں زیادہ بحث و تکرار گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ ایک مومن کا کام صرف اس سچائی کو تسلیم کرنا اور عملِ صالح میں مشغول رہنا ہے۔

خلاصہ درس:

1. کائنات کا پورا نقشہ اور ہر انسان کا مقدر تخلیقِ کائنات سے بہت پہلے طے کر دیا گیا تھا۔
2. ایمان کی سلامتی اسی میں ہے کہ ہم اللہ کے علم اور اس کی حکمت پر کامل بھروسہ رکھیں۔
3. تقدیر پر یقین انسان کو صبر، قناعت اور ذہنی سکون عطا کرتا ہے۔
4. دنیا کی مادی قوتوں کے پیچھے اصل طاقت اللہ کے ازلی فیصلوں کی ہے، اس لیے ہمیشہ اسی سے رجوع کرنا چاہیے۔

درس نمبر:40۔حدیث نمبر:80

موضوع: ہر چیز تقدیر کے تابع ہے، یہاں تک کہ عاجزی اور ہوشیاری بھی

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزِ وَالْكَيْسِ». (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

اردو ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہر چیز تقدیر کے ساتھ ہے، یہاں تک کہ عاجزی (نٹھلاپن، نکماپن) اور ہوشیاری (عقلمندی) بھی"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. **اَلْعَجْزِ**: اس سے مراد سستی، کاہلی یا کسی کام کو کرنے کی صلاحیت کا نہ ہونا ہے۔
2. **اَلْكَيْسِ**: اس کا مطلب ہے ہوشیاری، ذکاوت، عقلمندی اور کام کو مہارت سے کرنے کی صلاحیت۔
3. **بِقَدَرٍ**: یعنی اللہ کے اس ازلی فیصلے اور پیمانے کے مطابق جو اس نے کائنات بنانے سے پہلے مقرر فرما دیا تھا۔

تفصیلی تشریح:

اس مختصر مگر گہری حدیث کی وضاحت میں علماء اور محدثین نے تقدیر کے حوالے سے درج ذیل اہم نکات بیان فرمائے ہیں:

1. تقدیر کی ہمہ گیری: اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کا فیصلہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ صرف بڑے واقعات ہی نہیں، بلکہ انسان کی اپنی ذہنی کیفیات اور صلاحیتیں بھی اللہ کے پہلے سے طے شدہ نظام کا حصہ ہیں۔

2. ذہنی صلاحیتیں اور تقدیر: محدثین فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بہت ذہین (کیس) ہے تو یہ اس کا کمال نہیں بلکہ اللہ کی عطا کردہ تقدیر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کسی کام میں کمزور یا عاجز (عجز) رہ جاتا ہے، تو وہ بھی اللہ کے اسی نظام کے تحت ہے تاکہ انسان تکبر میں نہ آئے۔

3. انسان کی ذمہ داری: تقدیر پر ایمان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان کوشش چھوڑ کر بیٹھ جائے۔ اللہ نے انسان کو عقل اور اختیار دیا ہے تاکہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرے اور کوشش کرے۔ کامیابی اور ناکامی کے فیصلے اللہ کے ہاتھ میں ہیں، مگر حکم ہمیں محنت کا دیا گیا ہے۔

4. اللہ کا چھپا ہوا راز: تقدیر اللہ کا ایک ایسا راز ہے جسے مکمل طور پر سمجھنا انسانی عقل کے بس میں نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے ایک "گہرا سمندر" قرار دیا ہے جس میں زیادہ غوطہ زنی کرنے سے منع فرمایا گیا ہے تاکہ انسان گمراہ نہ ہو جائے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اور انسانی زندگی کا ہر ایک پہلو، چاہے وہ عقل و ہوشیاری ہو یا سستی و عاجزی، سب اللہ تعالیٰ کے ازلی علم اور تقدیر کے مطابق طے شدہ ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ انسان کو اپنی ذہانت پر غرور نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اپنی کمزوریوں پر مایوس ہونا چاہیے، بلکہ ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے کیونکہ یہ تمام مادی و معنوی صلاحیتیں اللہ کے ایک عظیم منصوبے کا حصہ ہیں۔ یہ پیراگراف ہمیں اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ پر کامل بھروسہ پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ ہم ظاہری اسباب کے بجائے اللہ کے فیصلے پر سکونِ قلب حاصل کریں۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1.احساسِ برتری اور کمتری کا علاج: آج کل لوگ اپنی ذہانت یا کامیابی پر بہت فخر کرتے ہیں، جبکہ ناکامی پر شدید مایوسی (Depression) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ حدیث سکھاتی ہے کہ ہوشیاری اللہ کی دین ہے اور عاجزی بھی اس کے حکم سے ہے، لہٰذا نہ کامیابی پر غرور ہونا چاہیے اور نہ ناکامی پر خود کو کوسنا چاہیے۔

2.نفسیاتی سکون: جب انسان یہ مان لیتا ہے کہ اس کی کوشش کے باوجود نتیجہ اللہ کی تقدیر سے ہے، تو اسے وہ قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے جو کسی دوا سے ممکن نہیں۔

3.تدبیر اور توکل کا توازن: ایک مومن کو چاہیے کہ وہ اپنی پوری ذہنی صلاحیت (کیس) استعمال کرے، مگر نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے۔ اگر عاجزی (عجز) آجائے تو اسے اللہ کی مشیت سمجھ کر صبر کرے۔

4.قسمت پر شکوہ کرنا: لوگ اکثر اپنی سستی کو تقدیر کا نام دے کر بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ تقدیر کو بہانہ بنا کر گناہ یا سستی کرنا غلط ہے، کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے، ہمیں صرف عمل کا حکم دیا گیا ہے۔

خلاصہ درس:

1. کائنات کا ذرہ ذرہ، یہاں تک کہ انسان کی اپنی ذہانت اور کمزوری بھی تقدیرِ الٰہی کے تابع ہے۔
2. کامیابی پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور عجز و ناکامی پر صبر کرنا چاہیے۔
3. تقدیر کے معاملے میں لایعنی بحثوں سے بچنا ایمان کی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔
4. انسان کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق بہترین کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ اللہ محنت کرنے والوں کی مدد فرماتا ہے۔

درس نمبر:41۔حدیث نمبر:81

موضوع: حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا مکالمہ اور تقدیر کی حقیقت

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «احْتَجَّ آدَمُ وَمُوسَى عَلَيْهِمَا السَّلَام عِنْدَ رَبِّهِمَا فَحَجَّ آدَمُ مُوسَى قَالَ مُوسَى أَنْتَ آدَمُ الَّذِي خَلَقَكَ اللَّهُ بِيَدِهِ وَنَفَخَ فِيكَ مِنْ رُوحِهِ وَأَسْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتَهُ وَأَسْكَنَكَ فِي جَنَّتِهِ ثُمَّ أَهْبَطْتَ النَّاسَ بِخَطِيئَتِكَ إِلَى الأَرْض فَقَالَ آدَمُ أَنْتَ مُوسَى الَّذِي اصْطَفَاكَ اللَّهُ بِرِسَالَتِهِ وَبِكَلَامِهِ وَأَعْطَاكَ الْأَلْوَاحَ فِيهَا تِبْيَانُ كُلِّ شَيْءٍ وَقَرَّبَكَ نَجِيًّا فَبِكَمْ وَجَدْتَ اللَّهَ كَتَبَ التَّوْرَاةَ قَبْلَ أَنْ أُخْلَقَ قَالَ مُوسَى بِأَرْبَعِينَ عَامًا قَالَ آدَمُ فَهَلْ وَجَدْتَ فِيهَا (وَعَصَى آدَمُ ربه فغوى) قَالَ نَعَمْ قَالَ أَفَتَلُومُنِي عَلَى أَنْ عَمِلْتُ عَمَلًا كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَيَّ أَنْ أَعْمَلَهُ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَنِي بِأَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَحَجَّ آدَمُ مُوسَى». (رَوَاهُ مُسلم)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے اپنے رب کے حضور بحث کی، تو آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: 'آپ وہ آدم ہیں جنہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اپنی روح پھونکی، فرشتوں سے سجدہ کروایا اور جنت میں بسایا، پھر آپ نے اپنی خطا کی وجہ سے لوگوں کو زمین پر اتار دیا؟' آدم علیہ السلام نے جواب دیا: 'آپ وہ موسیٰ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی رسالت اور کلام کے لیے چنا، آپ کو وہ تختیاں دیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا اور آپ کو سرگوشی کے لیے قریب کیا۔ آپ نے کیا پایا کہ اللہ نے میری تخلیق سے کتنا عرصہ پہلے تورات لکھی تھی؟' موسیٰ علیہ السلام نے کہا: 'چالیس سال پہلے۔' آدم علیہ السلام نے پوچھا: 'کیا آپ نے اس میں یہ پایا کہ 'آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ سے بھٹک گیا'؟' انہوں نے کہا: 'جی ہاں۔' آدم علیہ السلام

نے فرمایا: 'تو کیا آپ مجھے اس کام پر ملامت کرتے ہیں جس کا اللہ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا کہ میں اسے کروں گا؟' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'پس آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے'"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. اِحتَجَّ: دلیل و برہان کے ذریعے بحث کرنا۔ یہ مکالمہ عالمِ ارواح میں ہوا جہاں اسباب و علل کی پابندیاں نہیں تھیں۔
2. فَحَجَّ آدَمُ موسیٰ: آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر دلیل میں غالب آ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جواب زیادہ گہرا اور حقیقت پر مبنی تھا۔
3. نَفَخَ فِیکَ مِنْ رُوحِہِ: روح پھونکنا؛ یہ آدم علیہ السلام کی عظمت اور خاص تخلیق کی طرف اشارہ ہے۔
4. نَجِیًّا: وہ شخص جس سے راز و نیاز کی باتیں کی جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو 'کلیم اللہ' ہونے کی وجہ سے یہ مقام حاصل تھا۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں تقدیر اور انسانی عمل کے درمیان تعلق کو ایک عظیم مثال سے واضح کیا گیا ہے:

1. بحث کا مقام اور نوعیت: محدثین فرماتے ہیں کہ یہ مکالمہ دنیا میں نہیں بلکہ عالمِ بالا میں ہوا جہاں پردے اٹھے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد آدم علیہ السلام کی تحقیر نہیں تھا، بلکہ وہ اس 'سبب' کو جاننا چاہتے تھے جس کی وجہ سے انسانیت کو جنت سے زمین کی مشقتوں میں آنا پڑا۔

2. آدم علیہ السلام کی دلیل کی قوت: آدم علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ انہوں نے گناہ نہیں کیا، بلکہ انہوں نے واضح کیا کہ جس 'نتیجے' (زمین پر نزول) پر ملامت کی جا رہی ہے، وہ تو تخلیق سے پہلے ہی اللہ کے نقشے اور حکمت کا حصہ تھا۔ گویا وہ خطا تو محض ایک بہانہ تھی تاکہ اللہ کی اس عظیم تدبیر کو پورا کیا جا سکے جس کے تحت انسان کو زمین پر خلیفہ بنانا مقصود تھا۔

3. تقدیر گناہ کا عذر نہیں: علماء یہاں ایک باریک نکتہ بیان کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی دلیل صرف اس لیے قبول ہوئی کیونکہ وہ 'توبہ' کر چکے تھے اور ان کا معاملہ اللہ کے ہاں صاف ہو چکا تھا۔ ایک عام انسان گناہ کر کے تقدیر کا بہانہ نہیں بنا سکتا کیونکہ اسے شریعت کے احکامات پر عمل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

4. تخلیق سے پہلے کا علم: تورات کا آدم علیہ السلام کی پیدائش سے چالیس سال پہلے لکھا جانا اللہ کے اس ازلی علم کی دلیل ہے جس میں کائنات کا ایک ایک لمحہ پہلے سے درج۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ تقدیر اللہ تعالیٰ کا وہ اٹل فیصلہ اور مخفی راز ہے جس کی حقیقت کو انبیائے کرام بھی تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دینا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ کائنات میں وہی ہوتا ہے جو اللہ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے پہلے ہی طے کر رکھا ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ مصائب اور پیش آمدہ واقعات پر تقدیر کا یقین رکھنا دل کو سکون دیتا ہے، تاہم اس کا مقصد عمل سے غافل ہونا نہیں بلکہ یہ ماننا ہے کہ اللہ کا علم ہماری عقل سے بلند ہے۔ یہ پیراگراف ہمیں یہ بصیرت عطا کرتا ہے کہ ہم تقدیر کے معاملے میں لاحاصل بحثوں سے بچیں اور اللہ کی مشیت پر سرِ تسلیم خم کر دیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. ماضی کے پچھتاوے: اکثر لوگ ماضی کی غلطیوں پر خود کو کوستے رہتے ہیں یا دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ یہ سبق ہمیں سکھاتا ہے کہ توبہ کے بعد ماضی کے 'ہو چکے' واقعات کو اللہ کی تقدیر سمجھ کر راضی رہنا چاہیے تاکہ ذہنی سکون حاصل ہو۔

2. تقدیر اور جرم: آج کل بعض لوگ اپنے جرائم کا ملبہ 'قسمت' پر ڈال کر بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ تقدیر کا حوالہ صرف 'مصائب' پر دیا جا سکتا ہے، 'جرائم' پر نہیں۔ اگر کوئی چوری کر کے کہے کہ یہ میری تقدیر تھی، تو اسے سزا ملے گی کیونکہ اسے اختیار دیا گیا تھا۔

3.بحث وتکرار سے بچنا: تقدیر اللہ کا ایک گہرا راز ہے۔اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے درمیان یہ بحث علمی اور حقائق پر مبنی تھی، لیکن عام لوگوں کے لیے اس سمندر میں غوطہ لگانا گمراہی کا سبب بن سکتا ہے۔

4.اللہ کی حکمت پر بھروسہ: زندگی میں آنے والے اتار چڑھاؤ اللہ کی بڑی تدبیر کا حصہ ہوتے ہیں۔ جس طرح آدم علیہ السلام کا جنت سے نکلنا بظاہر 'خسارہ' تھا لیکن درحقیقت زمین پر انسانی تمدن کا آغاز تھا، اسی طرح ہماری زندگی کی ناکامیاں بھی کسی بڑی کامیابی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہیں۔

خلاصہ درس:

1. حضرت آدم علیہ السلام نے تقدیر کے الٰہی فیصلے کو دلیل بنا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لاجواب کر دیا۔
2. تقدیر پر ایمان انسان کو ماضی کے غموں سے نجات دلاتا ہے اور اللہ کی حکمت پر یقین پیدا کرتا ہے۔
3. تقدیر کو گناہوں کے لیے ڈھال بنانا درست نہیں، بلکہ توبہ اور اصلاحِ عمل اصل راستہ ہے۔
4. اللہ کا علم کائنات کی تخلیق اور ہر واقعے سے پہلے مکمل اور حتمی ہے۔

درس نمبر:42۔حدیث نمبر:82

موضوع:انسانی تخلیق کے مراحل اور تقدیر کے حتمی فیصلے

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ: «إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا ثُمَّ يَكُونُ فِي ذَلِكَ عَلَقَةً مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ يَكُونُ فِي ذَلِكَ مُضْغَةً مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ يُرْسَلُ الْمَلَكُ فَيُنْفَخُ فِيهِ الرُّوحُ وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ بِكَتْبِ رِزْقِهِ وَأَجَلِهِ وَعَمَلِهِ وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ فَوَالَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا». (متفق علیہ)

اردو ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیث سنائی اور وہ سچے اور مانے ہوئے (صادق ومصدوق) ہیں: "تم میں سے ہر ایک کی پیدائش (کے مراحل) اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفہ کی صورت میں جمع ہوتے ہیں، پھر اتنے ہی عرصہ (چالیس دن) وہ جما ہوا خون (علقہ) رہتا ہے، پھر اتنے ہی عرصہ وہ گوشت کا لوتھڑا (مضغہ) رہتا ہے۔ پھر اللہ ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے چار باتوں کے لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے: اس کا رزق، اس کی عمر، اس کا عمل اور یہ کہ وہ بدبخت ہے یا خوش بخت۔ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! تم میں سے ایک شخص اہلِ جنت کے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، مگر تقدیر (کا لکھا) اس پر غالب آجاتا ہے اور وہ دوزخیوں والے کام شروع کر دیتا ہے اور دوزخ میں چلا جاتا ہے؛ اور ایک شخص دوزخیوں والے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر تقدیر اس پر غالب آجاتی ہے اور وہ اہلِ جنت والے کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے"۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1. الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ: وہ جو اپنی ذات میں سچا ہے اور جس کی سچائی کی گواہی وحیِ الٰہی سے دی گئی ہے۔
2. نُطْفَة، عَلَقَة، مُضْغَة: انسانی تخلیق کے ابتدائی تین حیاتیاتی مراحل (قطرہ، جما ہوا خون، اور گوشت کا ٹکڑا)۔
3. ذِرَاع: ہاتھ کی لمبائی کا پیمانہ، جو یہاں موت کے قریب ہونے کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔
4. فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ: اس پر تقدیر کا وہ فیصلہ غالب آجاتا ہے جو اللہ کے ازلی علم میں پہلے سے موجود تھا۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں محدثین اور علماء نے انسانی زندگی کی ابتدا اور انتہا کے متعلق گہرے حقائق بیان کیے ہیں:

1. **تخلیق کے مراحل اور روح:** علماء فرماتے ہیں کہ 120 دن (تین چلے) مکمل ہونے پر روح پھونکی جاتی ہے۔ اس سے قبل وہ ایک نامی جسم ہوتا ہے، لیکن روح پڑنے کے بعد وہ ایک مکمل انسان بن جاتا ہے۔

2. **چار بنیادی فیصلے:** رزق، عمر اور انجام کا فیصلہ ماں کے پیٹ ہی میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علم میں یہ سب پہلے سے طے شدہ ہے، لیکن انسان کو اس تحریر کا علم نہیں دیا گیا تاکہ وہ کوشش جاری رکھے۔

3. **خاتمہ بالخیر کی اہمیت:** حدیث کے آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل اعتبار 'خاتمے' کا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنے موجودہ نیک اعمال پر غرور نہ کرے اور نہ ہی کوئی گناہ گار مایوس ہو، کیونکہ دلوں کو بدلنا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

4. **تقدیر اور عمل کا توازن:** صحابہ کے پوچھنے پر آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ تقدیر کے باوجود عمل کرنا ضروری ہے، کیونکہ ہر شخص کو اسی کام کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ انسان کو کبھی بھی اپنے موجودہ نیک اعمال پر غرور نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ حتمی فیصلہ اللہ کے علمِ ازلی اور تقدیر پر ہے۔ تخلیق کے مراحل اور پھر فرشتے کا رزق، موت اور انجام لکھ دینا اللہ کی قدرتِ کاملہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ہمیں اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ ہم ہمیشہ اللہ سے استقامت اور حسنِ خاتمہ کی دعا مانگیں، کیونکہ انسان کا آخری عمل ہی اس کی ابدی زندگی کا فیصلہ کرتا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور علمی رہنمائی:

1. **جدید ایمبریولوجی (علمِ جنین):** آج کی جدید سائنس بھی انسانی تخلیق کے ان مراحل کی تصدیق کرتی ہے جو آپ ﷺ نے چودہ سو سال پہلے بیان فرمائے تھے، جو آپ ﷺ کی نبوت کی سچائی کی دلیل ہے۔

2. **ڈپریشن اور رزق کی فکر:** جب یہ یقین ہو جائے کہ رزق اور زندگی کی مدت پہلے سے لکھی جا چکی ہے، تو انسان غیر ضروری پریشانیوں اور رزق کے لیے ناجائز ذرائع اختیار کرنے سے بچ جاتا ہے۔

3. **غرورِ عبادت کا علاج:** ایک نیک آدمی کو یہ ڈر رہنا چاہیے کہ انجام کیا ہوگا، جس سے اس کے اندر عاجزی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک گناہ گار کے لیے توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

4. **خودکشی اور مایوسی:** یہ حدیث سکھاتی ہے کہ آخری لمحے تک حالات بدل سکتے ہیں، اس لیے اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

خلاصہ درس:

1. انسانی زندگی کے آغاز ہی میں فرشتے کے ذریعے چار اہم فیصلے لکھ دیے جاتے ہیں۔
2. کامیابی کا دار و مدار صرف موجودہ حالت پر نہیں بلکہ 'خاتمے' پر ہے۔
3. تقدیر اللہ کا چھپا ہوا راز ہے، ہمارا کام شریعت کے مطابق عمل کرنا ہے۔
4. مومن کو ہمیشہ خوف اور امید کے درمیان رہنا چاہیے۔

درس نمبر: 43۔ حدیث نمبر: 83

موضوع: اعمال کا دار و مدار خاتمے پر ہے

وَعَن سهل بن سَعِيدٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ النَّارِ وَإِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنَّهُ من أهل النَّار وَإِنَّمَا الْعَمَّال بالخوا تيم»۔ (متفق عليه)

اردو ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بے شک کوئی بندہ (بظاہر) دوزخیوں والے کام کرتا ہے حالانکہ وہ (حقیقت میں) اہلِ جنت میں سے ہوتا ہے، اور کوئی بندہ (بظاہر) جنتیوں والے کام کرتا ہے حالانکہ وہ اہلِ دوزخ میں سے ہوتا ہے؛ کیونکہ اعمال کا دار و مدار تو ان کے خاتمے (آخری اعمال) پر ہے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. بِالْخَوَاتِيم: یہ 'خاتمہ' کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے انجام یا کسی چیز کا آخری حصہ۔ یہاں اس سے مراد موت کے وقت کی حالت ہے۔
2. إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ: 'بظاہر' کا لفظ یہاں شارحین نے اس لیے شامل کیا ہے کہ بعض اوقات انسان لوگوں کو دکھانے کے لیے یا محض عادتاً نیک کام کرتا ہے، لیکن اس کا باطن اس کے برعکس ہوتا ہے۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں انسانی زندگی کے سب سے حساس پہلو 'انجام' کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کے درج ذیل اہم پہلو بیان فرمائے ہیں:

1. اصل اعتبار انجام کا ہے: انسانی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، لیکن اللہ کے ہاں فیصلے کا مدار اس حالت پر ہے جس پر بندے کا انتقال ہوتا ہے۔ اگر کسی نے ساری زندگی گناہوں میں گزاری لیکن آخر میں سچی توبہ کر لی، تو اللہ اسے معاف فرما دیتا ہے۔

2. نیکی پر غرور سے بچنا: یہ حدیث ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو اپنی عبادات اور نیکیوں پر فخر کرتے ہیں۔ انجام کا علم صرف اللہ کو ہے، اس لیے ایک مومن کو ہمیشہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے فکر مند رہنا چاہیے۔

3. توبہ کی امید: یہ حدیث گناہ گاروں کے لیے مایوسی کے بادل چھٹاتی ہے۔ اللہ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ وہ آخری لمحات میں بھی بندے کی کایا پلٹ سکتا ہے اور اسے جہنم کے کنارے سے نکال کر جنت کا مستحق بنا سکتا ہے۔

4. باطن کی اصلاح: محدثین فرماتے ہیں کہ جو شخص بظاہر نیک اعمال کرتا ہے لیکن انجام برا ہوتا ہے، اس کے باطن میں اکثر کوئی ایسی پوشیدہ خرابی (جیسے ریاکاری یا تکبر) ہوتی ہے جو اسے آخری وقت میں دھوکہ دے جاتی ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ انسانی اعمال کی اصل قدر و قیمت ان کے خاتمے پر منحصر ہے۔ کوئی شخص زندگی بھر کیسے ہی عمل کرے، اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ اس کی موت کس حال میں آتی ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ نہ تو نیکی پر ناز کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی گناہ گار کو حقیر سمجھنا چاہیے، بلکہ ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں تکبر یا غفلت ہمارے انجام کو نہ بگاڑ دے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. دوسروں پر فتوے بازی: آج کل ہم کسی کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کے جنتی یا دوزخی ہونے کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ حتمی فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے ہمیں کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

2. ثابت قدمی کی دعا: چونکہ خاتمے کا علم کسی کو نہیں، اس لیے مسنون دعاؤں کے ذریعے اللہ سے ایمان پر ثابت قدمی مانگنی چاہیے۔ "اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ"۔

3. خود احتسابی: ہمیں اپنے اعمال کی ظاہری شکل کے ساتھ ساتھ اپنی نیتوں کو بھی پاک رکھنا چاہیے تاکہ ہمارا انجام باطن کی کسی خرابی کی وجہ سے خراب نہ ہو جائے۔

4.مایوسی کا علاج: اگر کوئی شخص گناہوں کی دلدل میں پھنسا ہوا محسوس کرے، تو اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سچی توبہ اسے جنتیوں کی فہرست میں شامل کر سکتی ہے۔

خلاصہ درس:

1. کسی کے ایمان یا کفر کا حتمی فیصلہ اس کے خاتمے پر منحصر ہے۔
2. اعمال میں تسلسل اور تادمِ مرگ نیکی پر قائم رہنا ہی اصل کامیابی ہے۔
3. مومن کو ہمیشہ خوف اور امید کے درمیان رہنا چاہیے؛ نہ اپنی نیکی پر ناز کرے اور نہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے مایوس ہو۔
4. خاتمہ بالخیر کے لیے اللہ سے مسلسل دعا اور باطن کی صفائی ضروری ہے۔

درس نمبر:44۔حدیث نمبر:86

موضوع: اعضاء کا زنا اور تقدیر الٰہی کا مفہوم

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا أَدْرَكَ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ فَزِنَا الْعَيْنِ النَّظَرُ وَزِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنَّى وَتَشْتَهِي وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذَلِكَ كُلَّهُ وَيُكَذِّبُهُ». (متفق علیہ)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے انسان کی تقدیر میں زنا کا وہ حصہ لکھ دیا ہے جسے وہ لازمی طور پر پائے گا: آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، زبان کا زنا بولنا ہے، نفس تمنا اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ ان سب کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب"۔ مسلم کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ: "کانوں کا زنا سننا ہے، ہاتھوں کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا چل کر جانا ہے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. أَدْرَكَ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ: یعنی انسان اپنی بشری کمزوری کی وجہ سے ان صغیرہ گناہوں (جیسے غیر ارادی نظر یا گفتگو) میں کسی نہ کسی حد تک مبتلا ہو جاتا ہے جو زنا کے مقدمات ہیں۔
2. يُصَدِّقُ ذَلِكَ وَيُكَذِّبُهُ: تصدیق کا مطلب ہے کہ انسان ان مقدمات کو عملی طور پر بڑے گناہ (زنا) میں تبدیل کر دے، اور تکذیب کا مطلب ہے کہ اللہ کے خوف سے رک جائے اور گناہِ کبیرہ سے بچ جائے۔
3. حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا: یہاں 'زنا' سے مراد صرف گناہِ کبیرہ نہیں بلکہ وہ تمام افعال ہیں جو اس کی طرف لے جاتے ہیں۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیث مبارکہ کی تشریح میں علماء اور محدثین نے درج ذیل اہم نکات بیان فرمائے ہیں:

1. مقدماتِ زنا کی سنگینی: شریعت میں صرف زنا حرام نہیں بلکہ وہ تمام راستے بھی بند کر دیے گئے ہیں جو اس گناہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ آنکھ کا دیکھنا، کان کا سننا اور پاؤں کا چل کر جانا در حقیقت اس بڑے گناہ کی تمہید ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ ان افعال کو 'زنا' اس لیے کہا گیا تاکہ انسان کے دل میں ان سے نفرت پیدا ہو اور وہ ابتدا ہی میں رک جائے۔

2. تقدیر اور انسانی اختیار: یہ کہنا کہ "اللہ نے لکھ دیا ہے" اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی جبلت میں خواہش رکھی گئی ہے اور وہ آزمائش میں ہے۔ لیکن حدیث کا آخری حصہ (تصدیق یا تکذیب) واضح کرتا ہے کہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اعضاء کو قابو میں رکھے یا انہیں گناہ کی کھلی چھوٹ دے دے۔

3.دل کی مرکزیت: نفس کا تمنا کرنا ظاہر کرتا ہے کہ تمام گناہوں کی جڑ انسانی سوچ اور تخیل ہے۔اگر انسان اپنے خیالات کی نگرانی کرے اور دل کو اللہ کی یاد سے آباد رکھے، تو اعضاء خود بخود گناہ سے رک جاتے ہیں۔

4.صغیرہ سے کبیرہ کا سفر: محدثین فرماتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی لغزشیں (جیسے نامحرم کو دیکھنا یا گفتگو کرنا) انسان کو بڑے گناہ کی طرف مائل کرتی ہیں۔جو شخص ان 'اعضاء کے زنا' سے نہیں بچتا، اس کے لیے گناہِ کبیرہ سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ گناہ صرف ظاہری بڑے افعال تک محدود نہیں بلکہ آنکھ کا دیکھنا، زبان کا بولنا، کان کا سننا اور دل کا خواہش کرنا بھی معصیت کی مختلف شکلیں ہیں۔یہ ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ اپنی بصارت، سماعت اور گفتگو کی حفاظت کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے کیونکہ بڑے گناہوں کی بنیاد یہی چھوٹے چھوٹے اقدامات بنتے ہیں۔یہ پیراگراف ہمیں اپنے اعضاء اور خیالات کی پاکیزگی برقرار رکھنے کی عملی ترغیب دیتا ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1.ڈیجیٹل دور کی فتنے: آج انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے "آنکھوں اور کانوں کا زنا" بہت آسان ہو گیا ہے۔نامحرم کی تصاویر دیکھنا اور فحش گفتگو سننا اسی حدیث کے زمرے میں آتا ہے۔ہمیں اپنے موبائل اور لیپ ٹاپ کے استعمال میں اللہ کا خوف رکھنا چاہیے۔

2.مخلوط معاشرت: دفاتر اور تعلیمی اداروں میں غیر ضروری گفتگو اور بے تکلفی "زبان کے زنا" کی طرف لے جاتی ہے۔شریعت ہمیں پردے اور حیا کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو بھی پاک رکھنے کی تعلیم دیتی ہے۔

3.خیالات کی پاکیزگی: نفس کی خواہشات پر پہرا دینا ضروری ہے۔جب بھی کوئی برا خیال آئے، اسے وہیں دبا دینا چاہیے تاکہ وہ 'عزم' اور پھر 'فعل' کی صورت اختیار نہ کرے۔

4.توبہ کا دروازہ: چونکہ انسان بشری طور پر کمزور ہے اور کہیں نہ کہیں ان لغزشوں کا شکار ہو جاتا ہے، اس لیے اللہ نے استغفار کا راستہ کھلا رکھا ہے تاکہ بندہ اپنی اصلاح کرتا رہے۔

خلاصہ درس:

1. آنکھ، کان، زبان، ہاتھ اور پاؤں کا غلط استعمال زنا کے مقدمات ہیں جن سے بچنا فرض ہے۔
2. انسان کو ان اعضاء کے استعمال پر اختیار دیا گیا ہے، اس لیے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔
3. ایمان کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ گناہ کے قریب لے جانے والے تمام راستوں کو بند کیا جائے۔
4. اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی خواہشات کو اللہ کے حکم کے تابع کر دے۔

درس نمبر:45۔حدیث نمبر:89

موضوع:انسانی دلوں پر اللہ کا مکمل اختیار اور استقامت کی دعا

وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَقُولُ إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ أُصْبُعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: اللَّهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ». (رواه مسلم)

اردو ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمام بنی آدم کے دل اللہ رحمن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی طرح ہیں، وہ انہیں جس طرف چاہتا ہے پھیر دیتا ہے"۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا مانگی: "اے دلوں کو پھیرنے والے اللہ! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. اُصْبُعَيْنِ: یہ "اصبع" کا تثنیہ ہے جس کا معنی "دو انگلیاں" ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ یہ ایک استعارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مکمل قدرت اور غلبے کو ظاہر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مادی جسم اور اعضاء سے پاک ہے، اس لیے یہاں انگلیوں سے مراد اس کی قوتِ تصرف اور اختیار ہے۔
2. يُصَرِّفُهُ: پھیرنا یا رخ بدلنا۔ جس طرح انسان اپنی انگلیوں میں موجود کسی چھوٹی چیز کو جس طرف چاہے آسانی سے گھما سکتا ہے، اللہ کے لیے پوری انسانیت کے دلوں کو بدلنا اس سے بھی کہیں زیادہ آسان ہے۔
3. مصَرِّفَ الْقُلُوبِ: دلوں کا رخ موڑنے والا۔ یہ اللہ کی ایک عظیم صفت ہے کہ وہ انسان کے خیالات اور ارادوں کا اصل مالک ہے۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں علماء اور شارحین نے درج ذیل اہم نکات بیان فرمائے ہیں:

1. اللہ کی قدرت کا کمال: یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ انسان اپنے دل کا بھی خود مختار مالک نہیں ہے۔ کسی کے دل میں نیکی کا خیال آنا یا بدی سے بیزاری پیدا ہونا در حقیقت اللہ کے قبضے میں ہے۔ یہ تصور انسان کے اندر سے تکبر ختم کرتا ہے اور اسے اللہ کا محتاج بناتا ہے۔

2. ایمان و کفر کا پلٹنا: محدثین فرماتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے موجودہ ایمان پر غرور نہ کرے، کیونکہ دل بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اللہ کسی بھی لمحے گناہ گار کو ہدایت دے سکتا ہے اور کسی نیک کہلانے والے کو اس کی کسی باطنی خرابی کی وجہ سے گمراہی میں ڈال سکتا ہے۔

3. دعا کی اہمیت: حضور ﷺ کا یہ دعا مانگنا کہ "ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے" امت کے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ جب معصوم عن الخطا نبی ﷺ یہ دعا مانگ رہے ہیں، تو ہم جیسے گناہ گاروں کو کتنی کثرت سے یہ دعا مانگنی چاہیے۔

4. امید اور خوف کا توازن: ایک مومن کو ہمیشہ اس بات کا ڈر رہنا چاہیے کہ کہیں اس کا دل حق سے نہ پھر جائے، اور ایک گناہ گار کو یہ امید رکھنی چاہیے کہ اللہ کسی بھی وقت اس کے دل کی کایا پلٹ سکتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کے مکمل اختیار اور قدرت میں ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں اپنی مشیت کے مطابق پھیر دیتا ہے۔ یہ ہمیں اس حقیقت سے باخبر کرتی ہے کہ ایمان کی سلامتی اور ہدایت پر ثابت قدمی سراسر اللہ کا فضل ہے، اس لیے ایک مومن کو کبھی بھی اپنی ظاہری عبادات یا تقویٰ پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ پیرا گراف ہمیں اللہ کی بارگاہ میں عاجزی اختیار کرنے اور ہر لمحہ "یا مقلب القلوب" والی دعا مانگنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو اور ہمارا دل اللہ کی اطاعت سے کبھی منحرف نہ ہو۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. ذہنی و قلبی بے چینی: آج کے دور میں لوگ اپنے خیالات اور جذبات پر قابو نہ پانے کی وجہ سے ذہنی دباؤ (Depression) کا شکار رہتے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں سکون دیتی ہے کہ اپنے دل کی لگام اللہ کے ہاتھ میں دے دیں اور اس سے استقامت کی دعا مانگیں۔

2. برائی سے بچنے کی حکمتِ عملی: جب ہم یہ محسوس کریں کہ ہمارا دل گناہ کی طرف مائل ہو رہا ہے، تو ہمیں فلسفیانہ بحثوں کے بجائے فوری طور پر اللہ سے رجوع کرنا چاہیے، کیونکہ وہی دلوں کو پھیرنے والا ہے۔

3. دوسروں کی اصلاح: ہمیں کسی گناہ گار کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، کیونکہ جس اللہ نے ہمیں ہدایت دی ہے، وہ ایک لمحے میں اس کے دل کو بھی بدل کر ہم سے بہتر بنا سکتا ہے۔

4. مسنون دعا کا اہتمام: اس حدیث میں مذکور دعا (اللَّهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ) کو اپنی زندگی کا معمول بنانا چاہیے، خاص طور پر فتنوں کے اس دور میں جب صبح کا مومن شام کو کافر ہو سکتا ہے۔

خلاصہ درس:

1. کائنات کے تمام انسانوں کے دل اللہ کے مکمل قبضے اور اختیار میں ہیں۔
2. ہدایت اور گمراہی کے تمام فیصلے اللہ کی مشیت اور حکمت پر مبنی ہیں۔
3. انسان کو اپنی نیکی پر فخر کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیے۔
4. اللہ کی اطاعت پر ثابت قدمی حاصل کرنے کے لیے دعا ہی سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

درس نمبر: 46۔ حدیث نمبر: 90

موضوع: انسانی فطرت اور ماحول کا اثر

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِيمَةُ بَهِيمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّونَ فِيهَا مِنْ جَدْعَاءَ ثُمَّ يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ (فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا) الآية». (متفق عليه)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ایک جانور (صحیح سالم) بچہ جنتا ہے، کیا تم اس میں کوئی کان کٹا (نقص والا) محسوس کرتے ہو؟ (یعنی وہ بعد میں اسے خود کاٹ دیتے ہیں)۔" پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (اپنی بات کی تائید میں) یہ آیت تلاوت فرماتے: "اللہ کی بنائی ہوئی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. **الْفِطْرَةِ:** اس سے مراد وہ پیدائشی استعداد اور میلان ہے جو حق کو قبول کرنے کے لیے انسان کے اندر رکھا گیا ہے۔ علماء کے نزدیک اس کا مطلب 'دینِ اسلام' ہے، یعنی اگر بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اللہ کی توحید کو ہی قبول کرے گا۔
2. **يُهَوِّدَانِهِ، يُنَصِّرَانِهِ، يُمَجِّسَانِهِ:** یعنی والدین کی تربیت اسے اسلام سے ہٹا کر دوسرے مذاہب کی طرف موڑ دیتی ہے۔
3. **بَهِيمَةً جَمْعَاءَ:** وہ جانور جو ہر عیب سے پاک اور مکمل پیدا ہوا ہو۔
4. **جَدْعَاءَ:** وہ جانور جس کا کان یا ناک کاٹ دی گئی ہو۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں انسانی نفسیات اور ایمان کی بنیاد کے حوالے سے نہایت گہرے حقائق بیان کیے گئے ہیں:

1. پیدائشی نیکی کا تصور: اسلام یہ سکھاتا ہے کہ انسان گناہ گار پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ خیر اور توحید کی فطرت لے کر دنیا میں آتا ہے۔ کفر، شرک اور برائی خارجی اثرات (والدین، معاشرہ اور ماحول) کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

2. والدین کی ذمہ داری: حضور ﷺ نے والدین کو بچے کی مذہبی شناخت کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ بچہ ایک سادہ کاغذ کی طرح ہوتا ہے جس پر پہلا نقش والدین کی تربیت کا ہوتا ہے۔ اگر والدین صحیح اسلامی خطوط پر تربیت کریں تو بچہ اپنی فطرت پر قائم رہتا ہے۔

3. تمثیل کی حکمت: آپ ﷺ نے جانور کے بچے کی مثال دی کہ وہ مکمل پیدا ہوتا ہے مگر انسان اپنے رسم ورواج کی خاطر اس کے کان کاٹ دیتے ہیں۔اسی طرح روح اپنی اصل میں نورانی پیدا ہوتی ہے، مگر دنیا کے باطل نظریات اس کی خوبصورتی کو مسخ کر دیتے ہیں۔

4. فطرت اور کائنات کا توازن: جس طرح کائنات کے تمام نظام اللہ کے قوانین کے تابع ہیں،انسانی روح بھی فطرتی طور پر اللہ کی بندگی کی طرف مائل ہے۔اسی لیے جب انسان حق کی بات سنتا ہے تو اس کا دل اس کی گواہی دیتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نومولود کو اسلام کی فطرتِ سلیمہ پر پیدا کیا ہے اور سچائی کو قبول کرنے کی صلاحیت ہر انسان کے خمیر میں رکھی گئی ہے۔یہ ہمیں والدین اور مربیوں کی اس بھاری ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے کہ ان کی تربیت ہی بچے کو حق کے راستے پر قائم رکھتی ہے یا اسے گمراہی کے گڑھے میں گرا دیتی ہے۔یہ ہمیں اپنے ماحول کو پاکیزہ رکھنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ انسانی فطرت خارجی اثرات کی وجہ سے مسخ نہ ہو اور ہم اپنے بچوں کو ایک سچا اور کھرا مسلمان بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. تربیتِ اولاد کا جدید چیلنج: آج کے دور میں والدین کے علاوہ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور تعلیمی ادارے "والدین" کا کردار ادا کر رہے ہیں۔بچوں کے ذہنوں کو غیر اسلامی نظریات سے بچانا اور انہیں ان کی اصل فطرت (اسلام) پر باقی رکھنا ایک بڑا چیلنج ہے۔

2. ماحول کی اہمیت: اگرچہ بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لیکن برا ماحول اسے بدل دیتا ہے۔ہمیں اپنے گھروں کا ماحول دینی بنانا چاہیے تاکہ بچوں کی فطری صلاحیتیں ضائع نہ ہوں۔

3. دعوتِ دین کا اسلوب: یہ حدیث داعیانِ دین کے لیے بہت اہم ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ ہر انسان کے اندر حق موجود ہے، بس اس کے اوپر سے غلط ماحول کی تہیں ہٹانے کی ضرورت ہے۔

4. اسلام کا آفاقی پیغام: یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ اسلام دنیا کا واحد دین ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، اسی لیے دنیا بھر میں لوگ عقل و شعور کی بنیاد پر جوق در جوق اسلام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

خلاصہ درس:

1. ہر بچہ توحید اور خیر کی استعداد لے کر پیدا ہوتا ہے۔
2. انسانی بگاڑ میں سب سے بڑا کردار ماحول اور ناقص تربیت کا ہے۔
3. والدین پر بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ اولاد کی فطری رہنمائی کریں نہ کہ انہیں گمراہ کریں۔
4. سچا دین وہی ہے جو انسانی ضمیر اور فطرت کی آواز کے مطابق ہو۔

درس نمبر: 47۔ حدیث نمبر: 103

موضوع: دل کی بے ثباتی اور ہوائے نفس کی مثال

وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَثَلُ الْقَلْبِ كَرِيشَةٍ بِأَرْضٍ فَلَاةٍ يُقَلِّبُهَا الرِّيَاحُ ظَهْرًا لِبَطْنٍ»۔ (رواہ احمد)

اردو ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دل کی مثال اس پَر (feather) جیسی ہے جو کسی بیابان میں پڑا ہو، جسے ہوائیں الٹتی پلٹتی رہتی ہیں"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. القَلْبِ: قلب کا لغوی معنی ہی الٹنا پلٹنا ہے۔انسانی دل کو قلب اسی لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔

2. رِیشَۃٍ: اس کا مطلب ہے پرندے کا پر۔ یہ انتہا درجے کی ہلکی چیز ہے جس کا اپنا کوئی وزن یا سمت نہیں ہوتی، بلکہ وہ ہوا کے تابع ہوتی ہے۔
3. فَلَاۃٍ: وسیع و عریض میدان یا بیابان جہاں ہوا کا رخ روکنے کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔
4. ظَھْرًا لِّبَطْنٍ: پیٹھ کے بل اور پیٹ کے بل۔ یہ ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے مکمل طور پر الٹ پلٹ کر دینا۔

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے ایک بہت بڑی نفسیاتی اور روحانی حقیقت کو ایک سادہ مثال سے واضح فرمایا ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کی شرح میں درج ذیل نکات بیان کیے ہیں:

1. انسانی ارادے کی کمزوری: جس طرح صحرا میں پڑا ہوا ایک ہلکا سا پر ہوا کے ہر تھپیڑے کے ساتھ اپنا رخ بدل لیتا ہے، اسی طرح انسانی دل بھی خیالات اور وسوسوں کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ کبھی نیکی کا غلبہ ہوتا ہے تو دل نرم ہو جاتا ہے، اور کبھی دنیاوی خواہشات اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔

2. دل کی تبدیلی اور تقدیر: محدثین فرماتے ہیں کہ دلوں کا یہ الٹنا پلٹنا در حقیقت اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو اپنے ایمان اور نیکی پر کبھی غرور نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ دل کو ثابت قدم رکھنا صرف اللہ کا کام ہے۔

3. ماحول کا اثر: بیابان کی مثال اس لیے دی گئی کہ وہاں ہوا کا زور زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جب انسان فتنوں کے دور میں یا برے ماحول میں ہوتا ہے، تو اس کے دل کے بھٹکنے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں جیسے کھلے میدان میں پڑے پر کے۔

4. خوف اور امید کا توازن: یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ ایک مومن ہمیشہ اپنے انجام کے بارے میں فکر مند رہے۔ اگر آج دل نیکی کی طرف مائل ہے تو یہ اللہ کا فضل ہے، اور اسے برقرار رکھنے کے لیے مسلسل اللہ سے رجوع ضروری ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ انسانی دل کی حالت ایک کھلے میدان میں پڑے ہوئے اس پر (feather) کی طرح ہے جسے تند و تیز ہوائیں مسلسل الٹتی پلٹتی رہتی ہیں۔ یہ ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ انسانی خیالات اور قلبی کیفیات میں پل بھر میں تبدیلی آسکتی ہے، اس لیے ہمیں اپنی نیکیوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے ہمیشہ اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ یہ پیراگراف ہمیں یہ فکر عطا کرتا ہے کہ ہم اپنے دل کی دنیا کو شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ذکرِ الٰہی کو اپنا شعار بنائیں، کیونکہ اللہ کی مدد کے بغیر دل کو حق پر قائم رکھنا ممکن نہیں۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. ذہنی اضطراب (Mental Instability): آج کے دور میں انسان پل بھر میں کچھ سوچتا ہے اور دوسرے ہی پل اس کا ارادہ بدل جاتا ہے۔ یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ یہ دل کی فطرت ہے، لہٰذا ہمیں اپنے ارادوں کو پختہ کرنے کے لیے اللہ سے مدد مانگنی چاہیے۔

2. ثابت قدمی کی دعا: چونکہ دل ہوا میں اڑتے پر کی طرح ہے، اس لیے ہمیں وہ دعا کثرت سے مانگنی چاہیے جو حضور ﷺ مانگا کرتے تھے: "اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ"۔

3. برے ماحول سے بچاؤ: جب ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا دل اتنا حساس اور ہلکا ہے کہ بیرونی اثرات (سوشل میڈیا، بری صحبت، گناہ کے مناظر) اسے فوراً متاثر کرتے ہیں، تو ہمیں اپنے دل کی حفاظت اسی طرح کرنی چاہیے جیسے کسی قیمتی چیز کی تیز ہوا سے حفاظت کی جاتی ہے۔

4. دوسروں کے لیے نرمی: جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دل کا بدلنا انسان کے اپنے بس میں نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، تو ہم دوسروں کی غلطیوں پر انہیں حقیر سمجھنے کے بجائے ان کی ہدایت کے لیے دعا کرنے لگتے ہیں۔

خلاصہ درس:

1. انسانی دل اپنی فطرت میں انتہا درجے کا غیر مستقل اور بدلنے والا ہے۔
2. ایمان کی سلامتی اور دل کی پختگی صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ممکن ہے۔

3. نیکی پر فخر کرنے کے بجائے ہمیشہ استقامت کی دعا مانگنی چاہیے۔
4. اپنے دل کو فتنوں کی زد سے بچا کر ذکرِ الٰہی کے قلعے میں رکھنا ہی دانشمندی ہے۔

درس نمبر:48۔حدیث نمبر:104

موضوع:ایمان کے چار بنیادی اور لازمی ارکان

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُؤْمِنَ بِأَرْبَعٍ: يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللَّهِ بَعَثَنِي بِالْحَقِّ، وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ، وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ، وَيُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ». (رواه الترمذي وابن ماجه)

اردو ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کوئی بندہ اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لے آئے: (1) اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں (محمد ﷺ) اللہ کا رسول ہوں جسے اس نے حق کے ساتھ بھیجا ہے، (2) موت پر ایمان لائے، (3) موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر ایمان لائے، اور (4) تقدیر پر ایمان لائے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. لَا يُؤْمِنُ: یہاں ایمان کی نفی سے مراد یہ ہے کہ ان چار چیزوں میں سے کسی ایک کا انکار بھی انسان کو دائرہ ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔
2. بَعَثَنِي بِالْحَقِّ: یعنی اللہ نے مجھے سچے دین اور یقینی دلائل کے ساتھ بھیجا ہے۔
3. الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ: اس سے مراد قیامت کے دن قبروں سے اٹھنا اور حساب کتاب کے لیے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے ایمان کی عمارت کے چار ایسے ستون بیان فرمائے ہیں جن پر انسانی نجات کا دار و مدار ہے۔ علماء اور محدثین نے ان کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

1. توحید اور رسالت کی گواہی: یہ ایمان کی بنیاد ہے۔ اللہ کی وحدانیت کو ماننا اور حضور ﷺ کو اللہ کا آخری سچا رسول تسلیم کرنا ہی اسلام میں داخل ہونے کی پہلی شرط ہے۔ "حق کے ساتھ بھیجا جانا" اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کی لائی ہوئی ہر بات قطعی اور سچی ہے۔

2. موت پر ایمان: اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان یہ پختہ یقین رکھے کہ یہ زندگی عارضی ہے اور موت کا ایک وقت مقرر ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ موت حادثاتی نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے آتی ہے؛ بیماری یا حادثہ تو محض ظاہری اسباب ہیں۔

3. آخرت اور حشر و نشر: مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا عقل اور نقل دونوں سے ثابت ہے۔ یہ یقین انسان کے اندر جواب دہی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اگر دوبارہ زندہ ہو کر حساب نہیں دینا تو پھر دنیا میں نیکی اور بدی کا فرق ختم ہو جائے گا۔

4. تقدیر پر یقین: یہ تسلیم کرنا کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ اللہ کے ازلی علم اور فیصلے کے مطابق ہے۔ نفع ہو یا نقصان، زندگی ہو یا موت، سب اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ یقین انسان کو مشکلات میں صبر اور نعمتوں پر شکر کی توفیق دیتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ اس وقت تک معتبر نہیں جب تک کہ انسان چار بنیادی ستونوں پر پختہ یقین نہ رکھے: اللہ کی توحید، رسول اللہ ﷺ کی سچی رسالت، موت اور اس کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کی حقیقت، اور اللہ کی طرف سے طے شدہ تقدیر۔ یہ ہمیں اپنے عقیدے کی بنیادیں مضبوط کرنے کی دعوت دیتی ہے کہ نجات کا راستہ صرف ان حقائق کو دل و جان سے تسلیم کرنے میں پوشیدہ ہے۔ یہ پیرا گراف

ہمیں یہ عملی ترغیب دیتا ہے کہ ہم زندگی کے ہر مرحلے پر آخرت کی جوابدہی کو سامنے رکھیں اور تقدیر کے فیصلوں پر راضی رہ کر اپنے ایمان کی حفاظت کریں۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. موت سے غفلت کا علاج: آج ہم دنیا کی رنگینیوں میں اس قدر کھو گئے ہیں کہ موت کو بھول بیٹھے ہیں۔ یہ حدیث یاد دلاتی ہے کہ موت پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہر وقت اس کے لیے تیار رہیں اور نیک اعمال کا ذخیرہ کریں۔
2. عقیدۂ آخرت اور معاشرتی اصلاح: جب انسان کو یقین ہو کہ اسے دوبارہ زندہ ہو کر اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے، تو وہ ظلم، جھوٹ اور بددیانتی سے رک جاتا ہے۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی بے راہ روی کی بڑی وجہ آخرت کے یقین کی کمی ہے۔
3. تقدیر اور ذہنی سکون: ڈپریشن اور ذہنی تناؤ کے اس دور میں تقدیر پر ایمان بہترین علاج ہے۔ جب بندہ یہ مان لیتا ہے کہ "جو کچھ مجھے پہنچا وہ مجھ سے چوک نہیں سکتا تھا"، تو وہ ناامیدی سے بچ جاتا ہے۔
4. حق کی پہچان: "بعثنی بالحق" کے الفاظ ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ حضور ﷺ کی سنت ہی حق ہے اور کامیابی صرف آپ ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے میں ہے۔

خلاصہ درس:

1. توحید، رسالت، موت، قیامت اور تقدیر ایمان کے لازمی اجزاء ہیں۔
2. ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی انسان کو مومن نہیں رہنے دیتا۔
3. ایمان بالقدر انسان کو مضبوط بناتا ہے اور اسے اللہ کی رضا پر راضی رہنا سکھاتا ہے۔
4. موت اور دوبارہ زندگی کا تصور انسان کو ذمہ دار اور باکردار بناتا ہے۔

درس نمبر:49۔ حدیث نمبر:109

موضوع: چھ ملعون گروہ اور ان کی تباہ کاریاں

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللَّهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ يُجَابُ: الزَّائِدُ فِي كِتَابِ اللَّهِ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدَرِ اللَّهِ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوتِ لِيُعِزَّ مَنْ أَذَلَّهُ اللَّهُ وَيُذِلَّ مَنْ أَعَزَّهُ اللَّهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللَّهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِي مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِي». (رواه البيهقي ورزين)

اردو ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "چھ قسم کے آدمی ایسے ہیں جن پر میں نے بھی لعنت کی ہے اور اللہ نے بھی لعنت فرمائی ہے، اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے: (1) اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا، (2) اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا، (3) زبردستی حکومت کرنے والا تاکہ اسے عزت دے جسے اللہ نے ذلیل کیا اور اسے ذلیل کرے جسے اللہ نے عزت دی، (4) اللہ کے حرم (مکہ) کی حرمت کو حلال سمجھنے والا، (5) میری اولاد (اہلِ بیت) کے بارے میں اس چیز کو حلال سمجھنے والا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، اور (6) میری سنت کو چھوڑ دینے والا"۔

تشریح و نکات:

اس حدیثِ مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے ان سنگین جرائم کا ذکر فرمایا ہے جو انسان کو اللہ اور اس کے رسول کی رحمت سے دور کر دیتے ہیں۔ علماء اور محدثین نے ان کی وضاحت درج ذیل انداز میں فرمائی ہے:

1. نبی کی بددعا: آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ "ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان چھ گروہوں کی ہلاکت یقینی ہے، کیونکہ اللہ اپنے نبیوں کی پکار کو رد نہیں فرماتا۔

2. قرآن میں تحریف: کتاب اللہ میں زیادتی سے مراد اس کے الفاظ بدلنا یا اپنی خواہش کے مطابق غلط معانی و مفاہیم نکالنا ہے۔

3. اہلِ بیت کا احترام: اہل بیت کی حرمت پامال کرنے سے مراد انہیں تکلیف دینا، ان کے حقوق غصب کرنا یا ان کی شان میں گستاخی کرنا ہے۔

4. سنت کی اہمیت: سنت چھوڑنے والے سے مراد وہ ہے جو دانستہ سنت سے اعراض کرے۔ اگر کوئی سنت کو حقیر سمجھ کر چھوڑے تو وہ کفر تک پہنچ سکتا ہے، اور اگر سستی سے چھوڑے تو گناہ گار ہے۔

5. ظالم حکمران: جو طاقت کے زور پر معیار بدل دے اور اللہ کے نیک بندوں کو ذلیل اور برے لوگوں کو عزت دے، وہ اللہ کی لعنت کا مستحق ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ دین میں تحریف کرنا، اللہ کی تقدیر کو جھٹلانا، ظلم و تکبر کے ذریعے اقتدار چلانا اور شعائرِ اللہ و حرمِ نبوی کی بے حرمتی کرنا ایسے سنگین جرائم ہیں جن پر اللہ اور اس کے تمام انبیاء کی لعنت برستی ہے۔ یہ ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ سنتِ نبوی کو چھوڑنا اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھنا انسان کو اللہ کی رحمت سے دور کر دیتا ہے۔ یہ پیراگراف ہمیں اپنے عقائد کی درستگی اور رسول اللہ ﷺ کی سنت و اہل بیت کی محبت و احترام پر ثابت قدم رہنے کی عملی ترغیب دیتا ہے تاکہ ہم اللہ کے غضب سے محفوظ رہ سکیں۔

عملی رہنمائی:

1. عقیدے کی حفاظت: ہمیں تقدیر کے معاملے میں شک سے بچنا چاہیے اور اسے اللہ کا اٹل فیصلہ ماننا چاہیے۔

2. شعائرِ اسلام کا احترام: مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جیسی مقدس جگہوں کی حرمت کا خیال رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

3. حبِ اہل بیت: حضور ﷺ کی آل سے محبت اور ان کا احترام ایمان کا حصہ ہے۔

4. اتباعِ سنت: زندگی کے ہر معاملے میں مسنون طریقے کو اپنا کر ہم اس وعید سے بچ سکتے ہیں۔

خلاصہ درس:

1. اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی لعنت ان لوگوں پر ہے جو دین کی بنیادوں (قرآن، سنت، تقدیر) سے کھلواڑ کرتے ہیں۔
2. سیاسی و سماجی طاقت کا غلط استعمال کر کے اللہ کے محبوب بندوں کو نیچا دکھانا ملعون صفت ہے۔
3. اہل بیت اور شعائر اللہ کی بے حرمتی ایمان کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔

باب: عذاب قبر کا ثبوت

درس نمبر: 50۔ حدیث نمبر: 126

موضوع: قبر کے سوالات، مومن کی کامیابی اور منافق کی ناکامی

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِي قَبْرِهِ وَتَوَلَّى عَنْهُ أَصْحَابُهُ وَإِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهِ فَيَقُولَانِ: مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ ﷺ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُولُ: أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ فَيُقَالُ لَهُ: انْظُرْ إِلَى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ أَبْدَلَكَ اللَّهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا جَمِيعًا... وَأَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ

فَيُقَالُ لَهُ: مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ؟ فَيَقُولُ: لَا أَدْرِي كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ... فَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيدٍ ضَرْبَةً فَيَصِيحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيهِ غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ»۔ (متفق علیہ)

اردو ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب بندے کو اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس چلے جاتے ہیں، تو وہ (مرنے والا) ان کے جوتوں کی آہٹ تک سنتا ہے۔ اس وقت دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں: 'تم اس شخص (محمد ﷺ) کے بارے میں کیا کہتے تھے؟' مومن جواب دیتا ہے: 'میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں'۔ اس سے کہا جاتا ہے: 'جہنم میں اپنا وہ ٹھکانہ دیکھو جس کے بدلے اللہ نے تمہیں جنت میں ٹھکانہ دے دیا ہے'۔ وہ دونوں ٹھکانوں کو دیکھتا ہے... جبکہ منافق اور کافر سے جب پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے: 'مجھے نہیں معلوم، میں وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے'۔ اسے لوہے کے ہتھوڑوں سے مارا جاتا ہے اور وہ ایسی چیخ مارتا ہے جسے انسانوں اور جنوں کے علاوہ اس کے آس پاس کی تمام مخلوق سنتی ہے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. قَرْعَ نِعَالِهِمْ: جوتوں کے زمین پر لگنے کی آواز۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرنے والے کو اتنی حس عطا کر دیتا ہے کہ وہ اپنوں کی واپسی کو محسوس کرتا ہے۔
2. مَلَكَانِ: دو فرشتے، جن کا نام دیگر احادیث میں 'منکر' اور 'نکیر' بتایا گیا ہے۔ ان کی شکلیں ہیبت ناک (کالی اور نیلی) ہوتی ہیں۔
3. مَطَارِقَ: 'مِطرقہ' کی جمع، جس کا مطلب ہے ہتھوڑا۔ یہاں اس سے مراد عذابِ قبر کے خاص آلات ہیں۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں عالمِ برزخ (قبر کی زندگی) کے ابتدائی مراحل کی نہایت جامع منظر کشی کی گئی ہے۔ علماء اور محدثین نے اس کی شرح میں درج ذیل نکات بیان فرمائے ہیں:

1. قبر کا امتحان: محدثین فرماتے ہیں کہ قبر کی زندگی کا اصل مدار حضور ﷺ کی پہچان پر ہے۔ فرشتے آپ ﷺ کی طرف اشارہ کر کے (یا تصویر دکھا کر) پوچھتے ہیں۔ مومن اپنے سچے عشق اور اتباع کی بدولت فوراً پہچان لیتا ہے، جبکہ منافق دنیا میں صرف زبانی دعوے کرتا تھا، اس لیے وہاں اس کی عقل کام نہیں کرتی۔

2. برزخی سماعت: علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مردہ قبر میں سنتا ہے، لیکن یہ سماعت دنیا کی سماعت جیسی نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ایک خاص قوت ہوتی ہے۔ جوتوں کی آہٹ سنانا اس لیے ہے تاکہ بندے کو تنہائی کا احساس ہو اور وہ امتحان کے لیے تیار ہو جائے۔

3. ٹھکانوں کا تبادلہ: مومن کو جہنم کا مقام اس لیے دکھایا جاتا ہے تاکہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے کتنے بڑے عذاب سے بچا کر جنت عطا فرمائی۔ اس سے اس کی خوشی دوچند ہو جاتی ہے۔

4. منافق کا انجام: منافق کا یہ کہنا کہ "میں وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے" ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پاس اپنی کوئی تحقیق اور سچا ایمان نہ تھا بلکہ وہ صرف بھیڑ چال کا حصہ تھا۔ اسی لیے اسے لوہے کے ہتھوڑوں سے مارا جاتا ہے۔

5. مخلوق کی سماعت: کافر کی چیخ انسانوں اور جنوں کو اس لیے نہیں سنائی جاتی کیونکہ یہ دنیا "دار الامتحان" ہے؛ اگر لوگ یہ چیخیں سن لیں تو ایمان لانا مجبوری بن جائے گا اور غیب پر ایمان کا تصور ختم ہو جائے گا۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ قبر کی زندگی ایک برحق حقیقت ہے جہاں انسان کے ظاہری جاہ و جلال کے بجائے صرف اس کے ایمان اور رسول اللہ ﷺ سے سچی وابستگی کا امتحان لیا جائے گا [20، 304]۔ ایک سچے مومن کا کمال یہ ہوگا کہ وہ وہاں بھی نبی کریم ﷺ کی رسالت کی گواہی دے گا، جبکہ منافق اور کافر اپنی محض زبانی دعویداری اور عوامی تقلید کی وجہ سے وہاں ناکام ہو جائیں گے۔ یہ ہمیں اس لرزہ خیز

انجام سے باخبر کرتی ہے کہ ایمان کے بغیر قبر کی تنگی اور ہتھوڑوں کی سزا سے بچنا ناممکن ہے، لہٰذا ہمیں اپنی زندگیوں کو سنت کے سانچے میں ڈھالنا چاہیے تاکہ وہاں ثابت قدمی نصیب ہو۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. **انفرادی جواب دہی:** آج ہم ہر کام میں لوگوں کی دیکھا دیکھی کرتے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں خبردار کرتی ہے کہ قبر میں "لوگ کیا کہتے تھے" کا عذر نہیں چلے گا، وہاں صرف آپ کا اپنا سچا ایمان اور عمل کام آئے گا۔
2. **محبتِ رسول ﷺ کی اہمیت:** قبر میں کامیابی کا دارومدار نبی کریم ﷺ کی معرفت پر ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی زندگیوں کو سنت کے مطابق ڈھالیں تاکہ وہاں آپ ﷺ کو پہچاننا آسان ہو۔
3. **موت کی یاد:** جوتوں کی آہٹ سننے کا تذکرہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ آخر کار سب نے ہمیں چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ اصل ساتھی صرف ہمارا ایمان اور نیک اعمال ہوں گے۔
4. **عذابِ قبر سے پناہ:** ہمیں مسنون دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے، خاص طور پر وہ دعا جو آپ ﷺ ہر نماز کے بعد مانگتے تھے: "اے اللہ! میں قبر کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

خلاصہ درس:

1. مرنے کے بعد قبر میں سب سے پہلا واسطہ منکر و نکیر کے سوالات سے پڑتا ہے۔
2. امتحان کا مرکزی سوال حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے متعلق ہوتا ہے۔
3. سچا مومن اپنے ایمان کی برکت سے کامیاب ہو کر جنت کی بشارت پاتا ہے۔
4. منافق اور کافر اپنی بے یقینی کی وجہ سے ناکام ہو کر سخت عذاب کا شکار ہوتے ہیں۔

درس نمبر: 51۔ حدیث نمبر: 128

موضوع: عذابِ قبر کی برحق حقیقت اور اس سے پناہ مانگنے کا نبوی طریقہ

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ يَهُودِيَّةً دَخَلَتْ عَلَيْهَا فَذَكَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ فَقَالَتْ لَهَا: أَعَاذَكِ اللَّهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ. فَسَأَلَتْ عَائِشَةُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَقَالَ: «نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ». قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا: فَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بَعْدُ صَلَّى صَلَاةً إِلَّا تَعَوَّذَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ۔ (متفق علیہ)

اردو ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک یہودی عورت ان کے پاس آئی اور عذابِ قبر کا ذکر کیا، پھر اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: "اللہ آپ کو قبر کے عذاب سے محفوظ رکھے"۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عذابِ قبر کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں، عذابِ قبر برحق ہے"۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے بعد میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ نے کوئی نماز پڑھی ہو اور اس میں عذابِ قبر سے پناہ نہ مانگی ہو۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ: اس سے مراد وہ برزخی زندگی ہے جو موت سے شروع ہو کر قیامت تک قائم رہتی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ "قبر" سے مراد صرف گڑھا نہیں بلکہ وہ عالم (برزخ) ہے جہاں انسان مرنے کے بعد رہتا ہے، خواہ وہ ڈوب گیا ہو یا جل گیا ہو۔
2. تَعَوَّذَ: پناہ مانگنا۔ نبی کریم ﷺ کا پناہ مانگنا امت کی تعلیم کے لیے تھا تاکہ وہ اس عظیم فتنے سے ہوشیار رہے۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ کے اہم نکات علماءاور محدثین نے درج ذیل بیان فرمائے ہیں:

1. علمِ نبوی کی وسعت: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پہلے اس کی حقیقت کا علم نہیں تھا۔ جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے وحی کی بنیاد پر اس کی تصدیق فرمائی۔

2. یہود کے پاس سابقہ علم: یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی عذابِ قبر کا ذکر موجود تھا، اسی لیے اس یہودی عورت نے اس کا ذکر کیا۔

3. نبوی معمول: اس واقعے کے بعد آپ ﷺ نے ہر نماز کے آخر میں عذابِ قبر سے پناہ مانگنا اپنا مستقل معمول بنالیا۔ محدثین فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی یہ دعا اس بات کی دلیل ہے کہ عذابِ قبر ایک بہت ہی ہولناک مرحلہ ہے جس سے اللہ کی پناہ کے بغیر بچنا ممکن نہیں۔

4. برزخ کی حقیقت: ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم ان غیبی حقائق پر یقین رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بتائے ہیں، چاہے وہ ہماری مادی آنکھ سے نظر نہ آئیں۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ قبر کا عذاب ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کی تصدیق خود نبی کریم ﷺ نے فرمائی اور اس سے بچنے کے لیے ہر نماز میں اللہ کی پناہ مانگنے کا اسوہ عطا فرمایا۔ یہ ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ عالمِ برزخ کے معاملات کو معمولی نہ سمجھا جائے، بلکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اس مرحلے کی آسانی کی دعا کی جائے۔ یہ پیراگراف ہمیں توبہ واستغفار کی کثرت اور عذابِ قبر سے بچنے والے اعمال کو اپنانے کی ترغیب دیتا ہے، کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ کا مسلسل پناہ مانگنا اس آزمائش کی سنگینی کی واضح دلیل ہے۔

موجودہ دور کے مسائل اور عملی رہنمائی:

1. غفلت کا علاج: آج کے دور میں ہم دنیا کی آسائشوں میں قبر کو بھول چکے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں یاد دلاتی ہے کہ قبر کی زندگی ایک مستقل حقیقت ہے جس کی تیاری ہر نماز کے ساتھ کرنی چاہیے۔

2. مسنون دعاؤں کا اہتمام: ہمیں ہر نماز کے تشہد کے آخر میں وہ چار دعائیں لازمی مانگنی چاہئیں جو آپ ﷺ نے سکھائیں: جہنم، قبر، زندگی و موت کے فتنوں اور دجال کے شر سے پناہ۔

3. عقلی شکوک وشبہات: بعض لوگ عذابِ قبر کو عقل کی ترازو میں تولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شریعت کا اصول ہے کہ غیب کی باتوں پر ایمان لانا ہی اصل کامیابی ہے۔

4. خوف اور امید: قبر کا ذکر ہمیں اللہ سے ڈرنے اور اپنی اصلاح کرنے پر ابھارتا ہے۔

خلاصہ درس:

1. عذابِ قبر ایک اٹل حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔
2. نبی کریم ﷺ کا ہر نماز کے بعد اس سے پناہ مانگنا اس کی سنگینی کو ظاہر کرتا ہے۔
3. مومن کو چاہیے کہ وہ اپنی برزخی زندگی کی سلامتی کے لیے اللہ سے مسلسل دعا کرتا رہے۔
4. سچی اتباع یہ ہے کہ ہم بھی آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے عذابِ قبر سے پناہ کے طلبگار رہیں۔

درس نمبر:52۔حدیث نمبر:129

موضوع: عذابِ قبر کی حقیقت اور چار بڑے فتنوں سے پناہ کی دعا

عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ ﷺ فِي حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلَى بَغْلَةٍ لَهُ وَنَحْنُ مَعَهُ إِذْ حَادَتْ بِهِ فَكَادَتْ تُلْقِيهِ وَإِذَا أَقْبُرُ سِتَّةٍ أَوْ خَمْسَةٍ أَوْ أَرْبَعَةٍ... فَقَالَ: «إِنَّ هَذِهِ الْأُمَّةَ تُبْتَلَى فِي قُبُورِهَا فَلَوْلَا أَنْ لَا تَدَافَنُوا لَدَعَوْتُ اللَّهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِي أَسْمَعُ مِنْهُ»۔ (رواہ مسلم)

اردو ترجمہ: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بنو نجار کے ایک باغ میں اپنے خچر پر سوار تھے اور ہم آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ اچانک خچر بدک گئی اور قریب تھا کہ وہ آپ ﷺ کو گرا دیتی، وہاں چار، پانچ یا چھ قبریں تھیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ ان قبروں والوں کو کون جانتا ہے؟ ایک شخص نے کہا کہ میں جانتا ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کب مرے تھے؟ اس نے عرض کیا کہ یہ شرک کے زمانے میں فوت ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس امت کی آزمائش قبروں میں ہوتی ہے، اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ تم دہشت کی وجہ سے اپنے مردوں کو دفنانا چھوڑ دو گے، تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ وہ تمہیں بھی قبر کا وہ عذاب سنا دے جو میں خود سن رہا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے ہماری طرف چہرہ مبارک کر کے فرمایا کہ آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو، قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو، ظاہر اور پوشیدہ فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگو، اور دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگو۔

لغوی و علمی تحقیق

1. حَائِطٍ: اس کا مطلب ہے چار دیواری والا باغ۔
2. بَغْلَةٍ: خچر (یہ مادہ خچر تھی جس پر آپ ﷺ سوار تھے)۔
3. حَادَتْ: بدک گئی یا راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گئی۔
4. تُبْتَلَى: آزمائی جاتی ہے یا عذاب دی جاتی ہے۔
5. لَاتَدَافَنُوا: تم ایک دوسرے کو دفنانا چھوڑ دیتے (دہشت کی وجہ سے)۔

تشریح و علمی نکات:

1. جانوروں کا ادراک: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو وہ حس عطا فرمائی ہے جس سے وہ عذابِ قبر کی ہولناکی کو محسوس کر سکتے ہیں، اسی لیے نبی کریم ﷺ کی سواری بدک گئی تھی۔

2. اللہ کی خاص حکمت: انسانوں کو عذابِ قبر کی آواز اس لیے نہیں سنائی گئی تاکہ نظامِ دنیا درہم برہم نہ ہو جائے اور لوگ دہشت کے مارے اپنے پیاروں کو دفنانے سے نہ رک جائیں۔ یہ اللہ کی بندوں پر ایک طرح کی پردہ پوشی اور رحمت ہے۔

3. نبوی بصیرت و سماعت: نبی کریم ﷺ کا مقام عام انسانوں سے بہت بلند ہے؛ آپ ﷺ ان غیبی آوازوں کو سنتے ہیں جنہیں عام کان سننے کی سکت نہیں رکھتے۔

4. چار فتنوں سے پناہ: آپ ﷺ نے خاص طور پر چار ہولناک چیزوں سے پناہ مانگنے کی تاکید فرمائی ہے: جہنم کا عذاب، قبر کا عذاب، ہر قسم کے ظاہری و باطنی فتنے اور دجال کا فتنہ۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے عذابِ قبر کی آوازوں کو انسانوں سے پوشیدہ رکھا ہے تاکہ وہ غفلت سے نکل کر عمل کی طرف متوجہ ہوں اور معاشرتی نظام متاثر نہ ہو۔ نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام کو آگ کے عذاب، قبر کی سختیوں اور فتنہ دجال سے پناہ مانگنے کی تلقین کرنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ آزمائشیں انتہائی کٹھن ہیں۔ یہ ہمیں ہر لمحہ بیدار رہنے اور مسنون دعاؤں کے ذریعے اللہ کی پناہ حاصل کرنے کا سبق سکھاتی ہے تاکہ ہم دنیا اور آخرت کے تمام ظاہری و باطنی فتنوں سے محفوظ رہ سکیں۔

عملی رہنمائی اور موجودہ دور:

غفلت سے بیداری: عذابِ قبر کوئی افسانہ نہیں بلکہ ایک اٹل حقیقت ہے جس کی تیاری ہمیں ہر وقت کرنی چاہیے۔

مسنون دعاؤں کی پابندی: ہمیں چاہیے کہ ہم ہر نماز کے آخری تشہد میں ان چاروں فتنوں سے پناہ مانگنے کو اپنا معمول بنالیں جیسا کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا۔

خوف اور امید کا توازن: قبر کے احوال سن کر جہاں دل میں اللہ کا خوف پیدا ہونا چاہیے، وہیں اللہ کی پناہ مانگنے سے دل کو سکون اور امید بھی حاصل ہونی چاہیے۔

خلاصہ درس:

1. قبر کی زندگی آزمائش اور جزا و سزا کا پہلا مرحلہ ہے۔
2. اللہ تعالیٰ نے رحمت کے طور پر عذاب کی آواز کو انسانوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔
3. مومن کو ہمہ وقت ان بڑے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے جو ایمان کو غارت کر سکتے ہیں۔

درس نمبر:54۔حدیث نمبر:131

موضوع: برزخی زندگی کی تفصیل: مومن کا انعام اور کافر کا عبرت ناک انجام

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «وَيَأْتِيهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُولَانِ لَهُ مَنْ رَبُّكَ فَيَقُولُ رَبِّيَ اللَّهُ فَيَقُولَانِ لَهُ مَا دِينُكَ فَيَقُولُ دِينِي الْإِسْلَامُ فَيَقُولَانِ لَهُ مَا هَذَا الرَّجُلُ الَّذِي بُعِثَ فِيكُمْ قَالَ فَيَقُولُ هُوَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُولَانِ وَمَا يُدْرِيكَ فَيَقُولُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللَّهِ فَآمَنْتُ بِهِ وَصَدَّقْتُ زَادَ فِي حَدِيثِ جرير فَذَلِكَ قَول الله عز وَجل (يثبت الله الَّذين آمنُوا بِالْقَوْل الثَّابِت) الْآيَة ثمَّ اتفقَا قَالَ فينادي مُنَاد من السَّمَاء أَن قد صدق عَبدِي فأفرشوه مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ وألبسوه من الْجنَّة قَالَ فيأتيه من روحها وطيبها قَالَ وَيفتح لَهُ فِيهَا مد بَصَره قَالَ وَإِن الْكَافِر فَذكر مَوته قَالَ وتعاد رُوحُهُ فِي جَسَدِهِ وَيَأْتِيهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُولَانِ لَهُ مَنْ رَبُّكَ فَيَقُولُ هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِي فَيَقُولَانِ لَهُ مَا دِينُكَ فَيَقُولُ هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِي فَيَقُولَانِ مَا هَذَا الرَّجُلُ الَّذِي بُعِثَ فِيكُمْ فَيَقُولُ هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِي فَيُنَادِي مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ أَنْ كَذَبَ فَأَفْرِشُوهُ مِنَ النَّارِ وَأَلْبِسُوهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى النَّارِ قَالَ فَيَأْتِيهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُومِهَا قَالَ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ حَتَّى تَخْتَلِفَ فِيهِ أَضْلَاعُهُ ثُمَّ يقيض لَهُ أعمى أبكم مَعَهُ مِرْزَبَّةٌ مِنْ حَدِيدٍ لَوْ ضُرِبَ بِهَا جبل لصار تُرَابا قَالَ فَيَضْرِبُهُ بِهَا ضَرْبَةً يَسْمَعُهَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِلَّا الثقلَيْن فَيصير تُرَابا قَالَ ثمَّ تُعَاد فِيهِ الرّوح» . رَوَاهُ أَحْمد وَأَبُو دَاوُد

اردو ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مومن کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں: 'تیرا رب کون ہے؟' وہ کہتا ہے: 'میرا رب اللہ ہے'۔ وہ پوچھتے ہیں: 'تیرا دین کیا ہے؟' وہ کہتا ہے: 'میرا دین اسلام ہے'۔ وہ پوچھتے ہیں: 'یہ کون صاحب ہیں جو تم میں بھیجے گئے؟' وہ کہتا ہے: 'یہ اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں'۔ وہ پوچھتے ہیں: 'تجھے یہ کیسے معلوم ہوا؟' وہ کہتا ہے: 'میں نے اللہ کی کتاب پڑھی، اس پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی'۔

تب آسمان سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے: 'میرے بندے نے سچ کہا، اس کے لیے جنت کا بچھونا بچھا دو، اسے جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو'۔ چنانچہ اسے جنت کی ہوا اور خوشبو آنے لگتی ہے اور اس کی قبر حدِ نگاہ تک وسیع کر دی جاتی ہے۔

پھر آپ ﷺ نے کافر کی موت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اس کی روح جسم میں لوٹائی جاتی ہے، فرشتے اسے بٹھا کر وہی سوالات کرتے ہیں لیکن وہ ہر سوال کے جواب میں کہتا ہے: 'ہائے افسوس! میں نہیں جانتا'۔ تب آسمان سے پکارنے والا پکارتا ہے: 'اس نے جھوٹ بولا، اس کے لیے آگ کا بچھونا بچھا دو، اسے آگ کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے جہنم کا دروازہ کھول دو'۔ اس تک جہنم کی تپش اور زہریلی ہوا پہنچتی ہے، اس کی قبر اس قدر تنگ کر دی جاتی ہے کہ پسلیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ پھر اس پر ایک اندھا اور بہرا فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے جس کے پاس لوہے کا ایسا ہتھوڑا ہوتا ہے کہ اگر پہاڑ پر مارا جائے تو وہ خاک ہو جائے۔ وہ اسے ایک ضرب لگاتا ہے جسے انسانوں اور جنوں کے علاوہ مشرق و مغرب کے درمیان تمام مخلوق سنتی ہے، وہ مٹی ہو جاتا ہے اور پھر اس میں روح لوٹا دی جاتی ہے (تاکہ عذاب جاری رہے)"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. مَدَّ بَصَرَہٗ: جہاں تک نگاہ پہنچے؛ یہ مومن کے لیے قبر کی بے انتہا وسعت کی علامت ہے۔
2. هَاهَاهَا: یہ عربی میں حسرت اور خوف کے وقت بولا جانے والا لفظ ہے، جو کافر کی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔
3. مِرْزَبَّةٌ: لوہے کا بڑا ہتھوڑا یا گرز۔
4. أَعْمَى أَبْكَمُ: اندھا اور بہرا؛ فرشتہ اندھا اس لیے ہے تاکہ وہ کافر کی تکلیف دیکھ کر رحم نہ کرے اور بہرا اس لیے تاکہ اس کی چیخیں نہ سن سکے۔

تفصیلی تشریح و علمی نکات:

1. **علمِ نافع کی اہمیت:** مومن کا یہ کہنا کہ 'میں نے اللہ کی کتاب پڑھی اور تصدیق کی' ثابت کرتا ہے کہ قبر میں کامیابی کا راز محض معلومات نہیں بلکہ قرآن کے ساتھ قلبی تعلق اور عملِ صالح ہے۔
2. **غیبی مدد:** 'القول الثابت' (مستحکم بات) سے مراد کلمہ طیبہ ہے، جس پر اللہ تعالیٰ مومن کو قبر کی وحشت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔
3. عذاب کی شدت: کافر کی پسلیوں کا ایک دوسرے میں دھنس جانا اور ہتھوڑے کی ضرب سے مٹی ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ برزخی عذاب صرف روحانی نہیں بلکہ جسمانی بھی محسوس ہوتا ہے۔
4. **تکرارِ عذاب:** روح کا بار بار لوٹایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ مجرمین کے لیے وہاں عذاب کا سلسلہ قیامت تک منقطع نہیں ہوگا۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ قبر کی زندگی اور وہاں ہونے والے سوالات ایک برحق حقیقت ہیں، جہاں کامیابی کا مدار صرف اور صرف اللہ کی وحدانیت پر یقین اور رسول اللہ ﷺ کی سچی اتباع پر ہے۔ ایک سچا مومن اپنی ایمانی بصیرت سے ان سوالات کے صحیح جواب دے کر جنت کی نعمتوں اور اس کی ہواؤں کا حقدار بن جاتا ہے، جبکہ کافر اور منافق اپنی بد عملی اور شک کی وجہ سے وہاں ناکام ہو کر ہولناک عذاب کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ سبق ہمیں اپنی زندگی کو سنت کے مطابق ڈھالنے کی فکر عطا کرتا ہے تاکہ عالمِ برزخ کی پہلی منزل میں ہمیں ثابت قدمی اور سکون نصیب ہو سکے۔

عملی رہنمائی:

قرآن سے دوستی: ہمیں چاہیے کہ قرآن کو صرف تلاوت تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے سمجھ کر پڑھیں تاکہ قبر کے سوالات کے وقت ہمارا دل گواہی دے سکے۔

خوفِ خدا: اندھے اور بہرے فرشتے کا تذکرہ ہمیں اس بات پر ابھارتا ہے کہ ہم گناہوں سے بچیں، کیونکہ وہاں کوئی سفارش یا رحم کام نہیں آئے گا۔

استقامت کی دعا: ہر نماز میں عذابِ قبر سے بچنے کی مسنون دعا لازمی کرنی چاہیے۔

خلاصہ درس:

مومن کے لیے قبر جنت کا باغ اور راحت کی جگہ ہے، جبکہ منکر کے لیے یہ ہولناک تنہائی اور عذاب کا گڑھا ہے۔ کامیابی کا دار و مدار اللہ کی کتاب پر ایمان اور اس کی تصدیق پر ہے۔

باب کتاب وسنت کے ساتھ جڑنے کا بیان

درس نمبر:56۔حدیث نمبر:140

موضوع: کتاب وسنت پر پختہ یقین اور بدعت کی مذمت

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»۔ (متفق علیہ)

اردو ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے ہمارے اس دین (معاملے) میں کوئی ایسی نئی چیز نکالی جو اس میں سے نہیں ہے، تو وہ مردود ہے"۔

لغوی وعلمی تحقیق:

1. أَحْدَثَ: دین میں ایسی نئی چیز ایجاد کرنا جس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہ ہو۔
2. أَمْرِنَا: اس سے مراد دینِ اسلام، شریعت کے معاملات اور ضابطہ حیات ہے۔
3. رَدٌّ: اس کا مطلب ہے وہ عمل باطل اور مسترد ہے، یعنی اللہ کے ہاں ایسا کام ناقابل قبول ہے اور اس پر کوئی اجر نہیں۔

تفصیلی تشریح:

1. دین کی کاملیت: یہ حدیث اس بنیادی اصول کو واضح کرتی ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے جس میں اپنی مرضی سے کسی بھی اضافے یا کمی کی گنجائش نہیں ہے۔

2. بدعت کی حقیقت: محدثین فرماتے ہیں کہ بدعت ہر اس کام کو کہا جاتا ہے جو ثواب کی نیت سے دین کا حصہ سمجھ کر کیا جائے لیکن اس کا ثبوت قرآن وسنت میں نہ ہو۔

3. قبولیت کا معیار: کسی بھی عمل کی قبولیت کے لیے اس کا سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق ہونا لازمی شرط ہے، ورنہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے، شرعی طور پر مردود ٹھہرے گا۔

4. نفع بخش نئے طریقے: یاد رہے کہ اگر کوئی نیا طریقہ یا ایجاد شریعت کے بنیادی مقاصد اور اصولوں کے خلاف نہ ہو (جیسے مدارس کی تعمیر یا دینی کتب کی اشاعت)، تو اسے بری بدعت نہیں کہا جائے گا۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ دینِ اسلام ایک کامل اور مکمل نظام ہے، جس میں اپنی طرف سے کسی بھی نئی بات یا بدعت کا اضافہ کرنا اسے اللہ کی بارگاہ میں مردود بنا دیتا ہے۔ یہ ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ نجات کا واحد راستہ وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے دکھایا ہے، اور اس راستے سے انحراف کر کے ایجاد کیا گیا ہر نیا طریقہ گمراہی ہے جو انسان کے اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔ یہ پیرا گراف ہمیں سنتِ نبوی ﷺ کی سختی سے پابندی کرنے اور دین کو ہر قسم کی خود ساختہ آمیزش سے پاک رکھنے کی بھرپور ترغیب دیتا ہے۔

عملی رہنمائی:

1. کسی بھی نئے رواج یا مذہبی عمل کو اپنانے سے پہلے مستند علمائے کرام سے اس کی شرعی حیثیت ضرور معلوم کرنی چاہیے۔
2. عبادات اور دینی معاملات میں صرف اسی طریقے کی پیروی کرنی چاہیے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے ثابت ہو۔
3. ہمیں اپنی زندگیوں کو قرآن و سنت کے دائرے میں محدود رکھنا چاہیے کیونکہ حقیقی کامیابی اتباع میں ہے، ایجاد میں نہیں۔

خلاصہ درس:

1. دینِ اسلام میں اپنی مرضی سے نئی چیزیں شامل کرنا اعمال کی بربادی کا سبب بنتا ہے۔
2. ہر وہ طریقہ جو قرآن و سنت کے بنیادی ڈھانچے سے متصادم ہو، وہ اللہ کے نزدیک قابلِ رد ہے۔
3. سنتِ نبوی ﷺ پر مضبوطی سے قائم رہنا ہی ایمان کی سلامتی کی ضمانت ہے۔

درس نمبر: 57۔ حدیث نمبر: 141

موضوع: بہترین کلام اور بہترین ہدایت کا معیار

وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ». (رواہ مسلم)

اردو ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (خطبے میں) ارشاد فرمایا: "حمد و ثنا کے بعد! بے شک بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ (ہدایت) محمد ﷺ کا طریقہ ہے، اور بدترین کام (دین میں) نکالی گئی نئی باتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. خَيْرَ الْحَدِيثِ: اس سے مراد قرآن مجید ہے جو تمام سابقہ کتب کا خلاصہ اور ہدایت کا سب سے سچا ذریعہ ہے۔
2. خَيْرَ الْهَدْيِ: وہ راستہ، سیرت اور طرزِ عمل جو نبی کریم ﷺ نے امت کو سکھایا۔
3. مُحْدَثَاتُهَا: دین میں ایسے نئے امور ایجاد کرنا جن کی اصل شریعت میں موجود نہ ہو۔
4. بِدْعَة: لغوی طور پر ہر نئی چیز کو کہتے ہیں، لیکن شرعی اصطلاح میں وہ نیا کام جو ثواب سمجھ کر دین میں شامل کیا جائے اور سنت کے خلاف ہو۔

تفصیلی تشریح:

1. قرآن و سنت کی مرکزیت: یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ ہدایت کے دو ہی بنیادی منبع ہیں: اللہ کا کلام اور رسول اللہ ﷺ کا اسوہ۔ جو شخص ان دو چیزوں کو مضبوطی سے تھام لے گا، وہ کبھی گمراہ نہیں ہو گا۔

2. بدعت کی سنگینی: دین میں اپنی طرف سے اضافے کو "بدترین کام" قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ (نعوذ باللہ) دین نامکمل تھا جسے پورا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

3. بدعت کی اقسام: علماء فرماتے ہیں کہ وہ نئی چیزیں جو دین کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہوں، وہ بدعتِ سیئہ (گمراہی) ہیں۔ تاہم، ایسی ایجادات جو دینی کاموں میں معاون ہوں (جیسے قرآن پر اعراب لگانا یا مدارس کی تعمیر) وہ اس وعید میں شامل نہیں بلکہ مستحسن ہیں۔

4. کامل اتباع: حقیقی کامیابی صرف اس طریقے میں ہے جو نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر کر کے دکھایا۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ کائنات میں بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین راستہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے، جبکہ دین میں نئے کام نکالنا (بدعت) بدترین عمل اور صریح گمراہی ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ جب بھی معاشرے میں نئی بدعات جنم لیں، ایک مومن کو مضبوطی

سے کتاب وسنت کا دامن تھام لیناچاہیے کیونکہ سنت کی روشنی ہی بدعت کی تاریکی کو ختم کرسکتی ہے۔یہ سبق ہمیں اپنی فکری و عملی زندگی کو نبوی ہدایت کے سانچے میں ڈھالنے کی دعوت دیتاہے تاکہ ہم گمراہی کے فتنوں سے محفوظ رہ سکیں۔

عملی رہنمائی:

1. ہمیں اپنے عقائد اور عبادات کو ہمیشہ قرآن اور سنتِ صحیحہ کی روشنی میں پرکھناچاہیے۔
2. کسی بھی ایسے نئے مذہبی طریقے سے بچناچاہیے جس کا ثبوت صحابہ کرام اور اسلاف سے نہ ملتاہو۔
3. دین کے معاملے میں عقل کے گھوڑے دوڑانے کے بجائے اتباعِ رسول ﷺ کو مقدم رکھناچاہیے۔
4. اپنی زبان اور عمل سے سنتِ نبوی ﷺ کو زندہ کرناچاہیے تاکہ بدعات کا خاتمہ ہوسکے۔

خلاصہ درس:

1. کائنات کا بہترین کلام اللہ کی کتاب اور بہترین نمونہ زندگی محمد ﷺ کا اسوہ ہے۔
2. دین میں اپنی خواہش سے پیدا کردہ نئے امور گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔
3. سنت پر عمل کرناہی وہ واحد راستہ ہے جو اللہ کی رضا اور جنت تک پہنچاتاہے۔

درس نمبر:58۔حدیث نمبر:142

موضوع:اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین لوگ اور بڑے جرائم

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَبْغَضُ النَّاسِ إِلَى اللهِ ثَلَاثَةٌ: مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ، وَمُبْتَغٍ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ، وَمُطَّلِبُ دَمِ امْرِئٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لِيُهَرِيقَ دَمَهُ». (رواه البخاري)

اردو ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ تین قسم کے لوگ ہیں: (1) وہ جو حرم مکہ میں رہتے ہوئے بے دینی یا ظلم کرے، (2) وہ جو اسلام لانے کے بعد بھی جاہلیت کی رسموں اور طریقوں کو رائج کرناچاہے، اور (3) وہ جو کسی مسلمان کا خون ناحق بہانے کا مطالبہ کرے"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. أَبْغَضُ النَّاسِ: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت سے بہت دور ہیں اور جن کے گناہ کی شدت باقی گناہ گاروں سے کہیں زیادہ ہے۔
2. مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ: یہاں 'الحاد' کا مطلب صرف اللہ کا انکار نہیں بلکہ اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا اور مکہ مکرمہ کی پاک زمین پر کوئی بھی گناہ کرناہے۔
3. سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ: وہ تمام رسم و رواج جو اسلام سے پہلے رائج تھے اور جنہیں اسلام نے ختم کردیا تھا۔
4. لِيُهَرِيقَ دَمَهُ: اس کا مطلب ہے کسی کی جان لینے کے درپے ہونا اور انسانی خون کی حرمت کا خیال نہ رکھنا۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تین ایسی خطرناک سماجی اور اخلاقی برائیوں سے خبردار فرمایاہے جو انسان کو اللہ کا دشمن بنادیتی ہیں۔پہلی قسم اس شخص کی ہے جو اللہ کے پاک گھر یعنی حرم مکہ کی بے حرمتی کرتاہے۔چونکہ حرم وہ جگہ ہے جہاں امن اور سلامتی کا حکم ہے، اس لیے وہاں کوئی بھی چھوٹا سا گناہ کرنا یا کسی پر ظلم کرنا باقی دنیا کے گناہوں کے مقابلے میں بہت زیادہ سنگین ہو جاتاہے، یہاں تک کہ وہاں کسی کو اذیت دینا بھی الحاد کے زمرے میں آتاہے۔

دوسرا وہ شخص اللہ کو سخت ناپسند ہے جو اسلام کی روشن تعلیمات مل جانے کے بعد بھی پرانی جاہلانہ رسموں کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ جاہلیت کی رسموں سے مراد وہ کام ہیں جو دینِ اسلام کے مزاج کے خلاف ہوں، جیسے مردوں پر بین کرنا، خاندانوں کے درمیان دشمنیاں پالنا، یا ایسی بدعات کو رائج کرنا جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں (جیسے قبروں پر چراغاں کرنا یا غیر اسلامی تہوار منانا)۔ ایسا شخص درحقیقت اسلام کی کاملیت کا انکار کرتا ہے اور دوبارہ معاشرے کو تاریکی کی طرف دھکیلنا چاہتا ہے۔

تیسری قسم اس ظالم انسان کی ہے جو کسی مسلمان بھائی کے خون کا پیاسا ہو جائے۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنی ذاتی دشمنی یا مفاد کی خاطر کسی بے گناہ کا خون بہانا چاہتا ہے اور اس کے لیے حیلے بہانے تلاش کرتا ہے۔ اسلام میں انسانی جان کی حرمت اتنی زیادہ ہے کہ ایک بے گناہ کا قتل پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا ہے، اس لیے ایسے سفاک شخص کو اللہ نے سب سے زیادہ ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہیں جو حرمِ پاک کی بے حرمتی کریں، اسلام کے پاکیزہ نظام میں جاہلیت کی رسموں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کریں، یا کسی مسلمان کا ناحق خون بہانے کے لیے حیلے تلاش کریں۔ یہ ہمیں انسانی جان کی حرمت اور اسلامی شعائر کے احترام کی انتہا درجے کی تاکید کرتی ہے اور جاہلانہ طور طریقوں سے بچنے کا درس دیتی ہے۔ یہ پیراگراف ہمیں ایک پرامن اور خالص اسلامی معاشرے کی تشکیل کی فکر دیتا ہے جہاں ظلم و ستم اور غیر شرعی رسومات کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

عملی رہنمائی:

1. ہمیں شعائر اللہ اور مقاماتِ مقدسہ، خصوصاً مکہ مکرمہ کا حد درجہ احترام کرنا چاہیے اور وہاں ہر قسم کی برائی سے بچنا چاہیے۔
2. اپنے گھروں اور معاشرے سے ایسی تمام رسموں کو جڑ سے ختم کرنا چاہیے جو قرآن و سنت سے ٹکراتی ہیں، چاہے وہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہوں۔
3. انسانی جان اور عزت کی حفاظت کو اپنا دینی فریضہ سمجھنا چاہیے اور کسی کے خلاف ناحق دشمنی سے باز رہنا چاہیے۔

خلاصہ درس: اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے سخت ناراض ہوتا ہے جو امن کے مرکز (حرم) میں فتنہ پھیلاتے ہیں، اسلام میں جاہلیت کی رسمیں لاتے ہیں اور انسانی جانوں سے کھیلتے ہیں۔ حقیقی کامیابی صرف قرآن و سنت کی مکمل اتباع میں ہے، نہ کہ اپنی خواہشات یا پرانے رواجوں کی پیروی میں۔

درس نمبر: 59۔ حدیث نمبر: 143

موضوع: اطاعتِ رسول ﷺ: جنت کی کنجی

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى. قِيلَ: وَمَنْ أَبَى؟ قَالَ: مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى»۔ (رواه البخاري)

اردو ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری تمام امت جنت میں داخل ہو گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا"۔ پوچھا گیا: "یا رسول اللہ! انکار کس نے کیا؟"۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گیا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے (جنت میں جانے سے) انکار کر دیا"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. أَبَى: اس کا لغوی معنی ہے کسی کام سے رک جانا، اسے قبول کرنے سے انکار کرنا یا اس سے اعراض کرنا۔
2. عَصَانِي: اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے احکامات کی روگردانی کرنا اور آپ ﷺ کی سنت کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چلنا ہے۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک بہت بڑی خوشخبری کے ساتھ ساتھ ایک لرزہ دینے والی تنبیہ بھی فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے واضح کیا کہ اللہ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ اس نے اس امت کے ہر فرد کے لیے جنت کی دعوت عام کر دی ہے، لیکن اس نعمت تک پہنچنے کے لیے ایک دروازہ مقرر کیا ہے اور وہ ہے "اطاعتِ مصطفیٰ ﷺ"۔ جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ کچھ لوگ جنت میں جانے سے خود ہی انکار کر دیں گے، تو صحابہ کرام حیرت زدہ ہو گئے کہ بھلا جنت جیسی راحت اور اللہ کی رضا سے کوئی عقل مند انسان کیسے منہ موڑ سکتا ہے؟

آپ ﷺ نے اس الجھن کو نہایت بصیرت انگیز جواب سے حل فرمایا کہ نافرمانی درحقیقت انکار ہی کی ایک شکل ہے۔ جو شخص آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو پسِ پشت ڈالتا ہے، سنتوں کا مذاق اڑاتا ہے یا ان پر عمل کرنے کو بوجھ سمجھتا ہے، وہ زبان سے چاہے کتنے ہی دعوے کرے، اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہا ہوتا ہے کہ اسے جنت کی طلب نہیں ہے۔ نافرمانی دراصل ایک قسم کی بغاوت ہے اور باغی شخص کبھی بھی بادشاہ کی مہمانی کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ یہ حدیث ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ جنت صرف تمناؤں اور آرزوؤں سے نہیں ملتی، بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر ثابت قدمی سے چلنے کا نام ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ جنت میں داخلے کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت اور فرمانبرداری پر رکھی گئی ہے۔ جو شخص آپ ﷺ کے لائے ہوئے احکامات کی پیروی کرتا ہے، وہ اللہ کے فضل سے جنت کا حقدار بن جاتا ہے، جبکہ آپ ﷺ کی نافرمانی کرنا درحقیقت جنت میں جانے سے خود ہی انکار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ نجات کا کوئی بھی راستہ سنتِ نبوی سے ہٹ کر نہیں ہے، لہٰذا ایک سچے مومن کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں آپ ﷺ کی سنت کو مقدم رکھنا چاہیے تاکہ وہ ابدی کامیابی پا سکے۔

عملی رہنمائی:

1. ہمیں اپنے روز و شب کا جائزہ لینا چاہیے کہ کیا ہم عملی طور پر اطاعت گزار ہیں یا ہماری نافرمانی ہمیں "انکار کرنے والوں" کی صف میں تو نہیں کھڑا کر رہی؟

2. سنتِ نبوی ﷺ پر عمل کرنا کوئی اضافی کام نہیں بلکہ یہ جنت میں داخلے کی لازمی شرط ہے، اس لیے ہمیں ہر چھوٹے بڑے معاملے میں شریعت کی پیروی کرنی چاہیے

3. گناہ اور معصیت کو معمولی سمجھ کر نظرانداز کرنا درحقیقت جنت کے دروازے کو اپنے اوپر بند کرنے کے مترادف ہے، اس لیے توبہ اور اصلاحِ احوال میں جلدی کرنی چاہیے۔

خلاصہ درس: نجات اور کامیابی کا واحد راستہ اطاعتِ رسول ﷺ ہے؛ آپ ﷺ کی فرمانبرداری جنت کا راستہ ہموار کرتی ہے، جبکہ نافرمانی انسان کو محرومی کی گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے۔

درس نمبر:60۔ حدیث نمبر:144

موضوع: نبی کریم ﷺ کی مثال اور دعوتِ جنت

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ يَقُولُ جَاءَتْ مَلَائِكَةٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَائِمٌ فَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوا إِنَّ لِصَاحِبِكُمْ هَذَا مَثَلًا فَاضْرِبُوا لَهُ مَثَلًا فَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوا مَثَلُهُ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى دَارًا وَجَعَلَ فِيهَا مَأْدُبَةً وَبَعَثَ دَاعِيًا فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَأَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ فَقَالُوا أَوِّلُوهَا لَهُ يَفْقَهْهَا فَقَالَ

بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوا فَالدَّارُ الْجَنَّةُ وَالدَّاعِي مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنْ أَطَاعَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ عَصَى مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ عَصَى اللَّهَ وَمُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ۔ (رواه البخاري)

اردو ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ فرشتے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے جب آپ ﷺ سو رہے تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کی مثال ایک ایسے شخص سے دی جس نے گھر بنایا، وہاں ضیافت کا اہتمام کیا اور ایک بلانے والے کو بھیجا۔ جس نے بلانے والے کی بات مان لی وہ گھر میں داخل ہوا اور کھانا کھایا، اور جس نے دعوت قبول نہ کی وہ نہ گھر میں داخل ہو سکا اور نہ کھانا کھا سکا۔ فرشتوں نے اس کی تعبیریوں کی کہ گھر سے مراد جنت ہے، بلانے والے محمد ﷺ ہیں، جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور محمد ﷺ لوگوں کے درمیان فرق (حق و باطل کا معیار) ہیں۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. اَلْعَيْنُ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبُ يَقْظَانُ: آنکھیں سوتی ہیں مگر دل بیدار رہتا ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی خاص صفت ہے کہ نیند ان کے قلبی ادراک اور وحی کے نزول میں رکاوٹ نہیں بنتی۔
2. مَأْدُبَةً: وہ ضیافت یا کھانا جو مہمانوں کے اعزاز میں تیار کیا جائے، یہاں اس سے مراد جنت کی لازوال نعمتیں ہیں۔
3. فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ: وہ ہستی جو لوگوں کو دو گروہوں (مومن و کافر یا سچے و جھوٹے) میں تقسیم کر دے۔ آپ ﷺ کی ذات وہ کسوٹی ہے جس سے انسان کے انجام کا پتا چلتا ہے۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیثِ مبارکہ میں فرشتوں کے مکالمے کے ذریعے دینِ اسلام کی حقیقت کو ایک نہایت عمدہ مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ علماء نے اس کی شرح میں درج ذیل نکات بیان فرمائے ہیں:

1. انبیاء علیہم السلام کی نیند کی حقیقت: اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی نیند عام لوگوں جیسی نہیں تھی بلکہ نیند کی حالت میں بھی آپ ﷺ کا قلبِ اطہر اللہ کی طرف متوجہ اور غیبی امور کا مشاہدہ کرتا تھا۔ اسی لیے فرشتے آپ ﷺ کے سرہانے کھڑے ہو کر یہ تمثیل بیان کر رہے تھے۔

2. اللہ کی مہمانی اور جنت: مثال میں گھر بنانے والا اور ضیافت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، جس نے اپنے بندوں کے لیے جنت جیسی عظیم نعمت تیار کی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت اللہ کا فضل ہے جو اس نے اپنے فرمانبردار بندوں کے لیے سجا رکھی ہے۔

3. محمد ﷺ بحیثیت داعی: نبی کریم ﷺ اس عظیم بادشاہ کے قاصد اور بلانے والے ہیں جو پوری انسانیت کو اس دائمی کامیابی کی طرف بلا رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی دعوت محض دنیاوی اصلاح نہیں بلکہ ابدی زندگی کی خوشحالی کی دعوت ہے۔

4. اطاعتِ رسول اور اطاعتِ خداوندی کا تعلق: فرشتوں نے واضح کیا کہ جس نے آپ ﷺ کی پکار پر لبیک کہا، اس نے درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں سوائے اس کے کہ نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلا جائے۔

5. حق و باطل کا معیار: آپ ﷺ کو "فرق" اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ کی ذات ہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانیت کی تقسیم ہو گی۔ آپ ﷺ کو ماننے والے ہدایت یافتہ کہلائیں گے اور آپ ﷺ سے اعراض کرنے والے گمراہ اور جنت کی نعمتوں سے محروم رہ جائیں گے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی صورت میں ایک عظیم ضیافت تیار کر رکھی ہے جس کی طرف بلانے والے داعی رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یہ پیرا گراف ہمیں ایک تمثیل کے ذریعے سمجھاتا ہے کہ جس طرح ایک سخی میزبان کی دعوت قبول کرنے والا ہی لذیذ

کھانوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، اسی طرح جو شخص رسول اللہ ﷺ کی پکار پر لبیک کہتا ہے اور آپ ﷺ کی اطاعت کا راستہ اختیار کرتا ہے، وہی جنت کی ابدی نعمتوں کا مستحق ٹھہرتا ہے[358،359]۔ یہ ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ آپ ﷺ ہی وہ ہستی ہیں جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والے ہیں اور آپ ﷺ کی پیروی ہی خالق تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔

عملی رہنمائی:

1. ہمیں پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ کی رضا اور جنت کی نعمتیں صرف اور صرف نبی کریم ﷺ کی غلامی اور اتباع میں پوشیدہ ہیں۔
2. دین کی طرف بلانا در حقیقت لوگوں کو ایک شاہی ضیافت (جنت) کی طرف بلانا ہے، اس لیے داعی کا لہجہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہونا چاہیے۔
3. اپنی زندگی کے ہر فیصلے میں سنتِ نبوی ﷺ کو سامنے رکھنا چاہیے کیونکہ یہی وہ واحد راستہ ہے جو ہمیں جہنم کی محرومی سے بچا کر جنت کے گھر تک پہنچا سکتا ہے۔

خلاصہ درس:

1. اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتیں ان لوگوں کے لیے تیار کی ہیں جو نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کرتے ہیں۔
2. آپ ﷺ کی فرماں برداری ہی اللہ تعالیٰ کی سچی اطاعت اور کامیابی کی ضامن ہے۔
3. حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ حق و باطل میں تمیز کرنے والی وہ کسوٹی ہے جس پر ہر انسان کا انجام پرکھا جائے گا۔

درس نمبر: 61۔ حدیث نمبر: 145

موضوع: رہبانیت کی نفی اور سنتِ نبوی ﷺ میں اعتدال

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يَقُولُ جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى بُيُوتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا أُخبروا كَأَنَّهُمْ تقالوها فَقَالُوا وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ قَالَ أحدهم أما أَنَا فَإِنِّي أُصَلِّي اللَّيْلَ أبدا وَقَالَ آخر أَنَا أَصوم الدَّهْرَ وَلَا أفطر وَقَالَ آخر أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا فَجَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ: «أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا أَمَا وَاللَّهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مني». (متفق عليه)

اردو ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین آدمیوں کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھروں میں آپ ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھنے آئی۔ جب انہیں بتایا گیا تو انہوں نے (اپنی عبادت کے مقابلے میں) اسے کم خیال کیا اور کہا: "ہمارا نبی ﷺ سے کیا مقابلہ، اللہ نے تو ان کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں!" ایک نے کہا: "میں ہمیشہ پوری رات نماز پڑھوں گا"۔ دوسرے نے کہا: "میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہیں کروں گا"۔ تیسرے نے کہا: "میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا"۔ پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: "کیا تم نے ہی یہ باتیں کہی ہیں؟ اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تقویٰ رکھنے والا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. رَهْط: تین سے دس آدمیوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔
2. تَقَالُّوهَا: اسے (یعنی آپ ﷺ کی عبادت کو) تھوڑا یا معمولی خیال کیا۔

3. أَرْقُدُ: میں سوتا ہوں۔ رُقود 'نیند کو کہتے ہیں۔
4. رَغِبَ عَنْ: کسی چیز سے اعراض کرنا یا اسے ناپسند کرنا۔

تفصیلی تشریح:

1. غلو اور انتہا پسندی کی ممانعت: ان تین صحابہ کرام (حضرت علی، حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم) کی نیت نیک تھی، وہ اللہ کا قرب چاہتے تھے، مگر انہوں نے ایسا طریقہ چنا جو انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ دین میں سختی پیدا کرنا نیکی نہیں ہے۔

2. فطرت اور بندگی کا توازن: اسلام دنیا کو ترک کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے اسے اللہ کے احکام کے مطابق گزارنے کا نام ہے۔ نیند، کھانا پینا اور نکاح کرنا بندگی کے منافی نہیں بلکہ سنت کا حصہ ہیں۔

3. نبی ﷺ کا اسوہ ہی مکمل ہے: آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ کا خوف رکھتا ہوں، اس کے باوجود میں وہ کام کرتا ہوں جنہیں تم نے "کم عبادت" سمجھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تقویٰ کا اصل معیار بوجھ اٹھانا نہیں بلکہ سنت کی اتباع کرنا ہے۔

4. سنت سے اعراض کا وبال: "فلیس منی" (وہ مجھ سے نہیں) کے الفاظ ایک سخت تنبیہ ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص سنت کو ناقص سمجھ کر اپنی طرف سے نئے طریقے ایجاد کرتا ہے، وہ اس جماعت سے خارج ہے جو نبوی راستے پر چلنے والی ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ نیکی صرف مشقت اٹھانے کا نام نہیں ہے، بلکہ نیکی اس طریقے کو اپنانے کا نام ہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے سکھایا ہے۔ صحابہ کرام نے جب یہ سوچا کہ نبی ﷺ تو معصوم ہیں اس لیے انہیں کم عبادت بھی کافی ہے، تو آپ ﷺ نے اس سوچ کی اصلاح فرمائی کہ عبادت کا مقصد صرف بخشش نہیں بلکہ اللہ کا شکر گزار بندہ بننا اور اس کی دی ہوئی حدود میں رہنا ہے۔ اسلام رہبانیت (دنیا چھوڑ دینے) کے بجائے معاشرت میں رہ کر اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔

عملی رہنمائی:

1. اپنی زندگی کے تمام معاملات میں اعتدال پیدا کریں اور غلو (انتہا پسندی) سے بچیں۔
2. نکاح اور خاندانی ذمہ داریوں کو بوجھ سمجھنے کے بجائے انہیں سنتِ نبوی سمجھ کر ادا کریں۔
3. نفل عبادات اتنی ہی کریں جتنی آپ کا جسم اور ذہن آسانی سے برداشت کر سکے، تاکہ تاہنگ آکر انہیں چھوڑ نہ دیں۔
4. اپنے نظریات اور عبادات کو ہمیشہ سنتِ صحیحہ کی کسوٹی پر پرکھیں، محض زبانی جوش و خروش پر نہ چلیں۔

خلاصہ درس:

1. سنتِ نبوی ﷺ ہی تقویٰ اور قربِ الٰہی کا واحد مستند راستہ ہے۔
2. اسلام میں رہبانیت اور دنیا سے مکمل کنارہ کشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔
3. نیکی کا اصل معیار اعمال کی کثرت نہیں بلکہ ان کا سنت کے مطابق ہونا ہے۔

درس نمبر: 62۔ حدیث نمبر: 146

موضوع: اتباعِ سنت میں میانہ روی اور رخصتوں کی اہمیت

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: صَنَعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ شَيْئًا فَرَخَّصَ فِيهِ فَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ فَبَلَغَ ذَلِكَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَخَطَبَ فَحَمِدَ اللَّهَ ثُمَّ قَالَ: «مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُونَ عَنِ الشَّيْءِ أَصْنَعُهُ فَوَاللَّهِ إِنِّي لأعلمهم بِاللَّهِ وأشدهم لَهُ خشيَة»۔

(متفق علیہ)

اردو ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کام کیا اور اس کی (دوسروں کو بھی) اجازت دی، لیکن کچھ لوگوں نے اس سے احتراز کیا (یعنی اسے نیکی کے خلاف سمجھ کر نہ کیا)۔ جب آپ ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا، اللہ کی حمد و ثناء بیان کی اور فرمایا: "ان لوگوں کا کیا حال ہے جو اس کام سے بچتے ہیں جسے میں خود کرتا ہوں؟ اللہ کی قسم! میں ان سب کے مقابلے میں اللہ کو زیادہ جاننے والا اور اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. فَرَخَّصَ فِيهِ: اس میں رخصت اور آسانی عطا فرمائی۔
2. فَتَنَزَّهَ عَنْهُ: اس سے بچنے لگے یا اسے اپنے لیے تقویٰ کے خلاف سمجھ کر چھوڑ دیا۔
3. أَشَدهم لَهُ خشيَة: اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا۔ یعنی تقویٰ کا معیار وہ نہیں جو تم خود سے طے کر لو، بلکہ وہ ہے جو نبی کی سنت ہے۔

تفصیلی تشریح:

اس حدیث کی روشنی میں محدثین نے درج ذیل نکات بیان کیے ہیں:

1. سنت ہی معیارِ تقویٰ ہے: کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی دی ہوئی رخصتوں (رعایتوں) پر عمل کرنا کمالِ تقویٰ کے خلاف ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ نے واضح فرمایا کہ اصل تقویٰ آپ ﷺ کی پیروی میں ہے۔

2. رخصتوں کی حکمت: اللہ تعالیٰ جس طرح عزیمت (سخت احکامات) پر عمل کو پسند کرتا ہے، اسی طرح وہ بندوں کی کمزوریوں کے پیشِ نظر اپنی دی ہوئی رخصتوں پر عمل کو بھی پسند کرتا ہے۔

3. غلو کی ممانعت: دین میں اپنی طرف سے سختی پیدا کرنا یا ایسی پارسائی کا دعویٰ کرنا جو سنتِ نبوی سے متصادم ہو، ناپسندیدہ عمل ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ بندگی اور تقویٰ کا حقیقی معیار صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، اور آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ سے ہٹ کر اپنی طرف سے وضع کردہ سختیوں یا پارسائی کے معیارات کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے۔ یہ ہمیں اس لرزہ خیز حقیقت سے باخبر کرتی ہے کہ جب انسان اللہ کی دی ہوئی رخصتوں اور نبی ﷺ کے عمل کو اپنے تقویٰ کے لیے ناکافی سمجھنے لگتا ہے، تو وہ انجانے میں اللہ کے رسول ﷺ سے بھی بڑھ کر متقی ہونے کا دعویٰ کر رہا ہوتا ہے، جو کہ ایک سنگین فکری گمراہی ہے۔ حضور ﷺ کا غصہ فرمانا اس نبوی حکمت کو ظاہر کرتا ہے کہ دین کو فطری حدود میں رکھنا ضروری ہے؛ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ آپ ﷺ ہی کائنات میں اللہ کی عظمت کو سب سے زیادہ پہچاننے والے اور سب سے زیادہ خشیتِ الٰہی رکھنے والے ہیں، لہٰذا جس کام کو آپ ﷺ نے جائز قرار دے کر خود کیا، اس سے بچنا نیکی نہیں بلکہ سنت سے اعراض ہے۔ یہ پیرا گراف ہمیں اپنی زندگی میں میانہ روی اختیار کرنے، اللہ کی دی ہوئی آسانیوں پر شکر گزاری کے ساتھ عمل کرنے اور اپنے زہد و تقویٰ کو سنتِ نبوی کے تابع رکھنے کی بھرپور ترغیب دیتا ہے تاکہ ہمارا عمل بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو سکے۔

عملی رہنمائی:

1. ہمیں کسی ایسے کام کو اپنے اوپر حرام نہیں کرنا چاہیے جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال قرار دیا ہو۔
2. تقویٰ کا مطلب سنت کی پیروی ہے، نہ کہ اپنی طرف سے نئی سختیاں ایجاد کرنا۔
3. اللہ کی دی ہوئی سہولتوں اور رخصتوں پر عمل کرنا بھی بندگی کا حصہ ہے۔

خلاصہ درس:

1. اصل تقویٰ سنتِ نبوی کی کامل پیروی میں ہے۔
2. نبی کریم ﷺ کی دی ہوئی رخصتوں سے اعراض کرنا ناپسندیدہ ہے۔
3. حضور ﷺ اللہ کی ذات اور خشیت کا سب سے بلند مقام رکھتے ہیں، ان کے عمل سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہو سکتی۔

درس نمبر: 63۔ حدیث نمبر: 148

موضوع: اطاعتِ رسول ﷺ اور نجات کی مثال

وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتَى قَوْمًا فَقَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي رَأَيْتُ الْجَيْشَ بِعَيْنَيَّ وَإِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ فَالنَّجَاءَ النَّجَاءَ فَأَطَاعَهُ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهِ فَأَدْلَجُوا فَانْطَلَقُوا عَلَى مَهْلِهِمْ فَنَجَوْا وَكَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوا مَكَانَهُمْ فَصَبَّحَهُمُ الْجَيْشُ فَأَهْلَكَهُمْ وَاجْتَاحَهُمْ فَذَلِكَ مَثَلُ مَنْ أَطَاعَنِي فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِهِ وَمثل من عَصَانِي وَكذب بِمَا جِئْتُ بِهِ مِنَ الْحَقِّ». (متفق عليه)

اردو ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میری اور اس پیغام کی مثال جس کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا ہے اس شخص کی سی ہے جو اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا: اے میری قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے (دشمن کا) لشکر دیکھا ہے اور میں تمہیں برہنہ ہو کر صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں، لہٰذا بچو، بچو!۔ چنانچہ اس کی قوم کے ایک گروہ نے اس کی بات مان لی اور رات کے وقت ہی وہاں سے خاموشی سے نکل کر محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔ جبکہ دوسرے گروہ نے اسے جھٹلایا اور اپنی جگہ پر ہی ٹھہرے رہے، تو صبح ہوتے ہی لشکر نے ان پر حملہ کر کے انہیں ہلاک اور تباہ کر دیا۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے میری اطاعت کی اور میرے لائے ہوئے حق کی پیروی کی، اور اس شخص کی مثال ہے جس نے میری نافرمانی کی اور اس حق کو جھٹلایا جو میں لے کر آیا ہوں"۔

لغوی و علمی تحقیق:

1. النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ: عربوں میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی دشمن کے لشکر کو دیکھتا تو خطرے کی شدت ظاہر کرنے کے لیے اپنے کپڑے اتار کر لہراتا تاکہ لوگ فوراً متوجہ ہو جائیں۔ اسے "برہنہ ڈرانے والا" کہا جاتا تھا جو کہ انتہائی شدید خطرے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔
2. فَأَدْلَجُوا: وہ رات کے پہلے حصے میں چل پڑے۔
3. النَّجَاءَ النَّجَاءَ: جلدی بچو، جلدی بھاگو۔

تفصیلی تشریح:

1. رسالت کی سچائی: آپ ﷺ نے اپنی دعوت کو ایک ایسے عینی مشاہدے سے تشبیہ دی ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔
2. اطاعت ہی نجات ہے: جو لوگ حق کو پہچان کر فوراً عمل کرتے ہیں، وہ دنیا و آخرت کے عذاب سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔
3. جھٹلانے کا انجام: حق کو معمولی سمجھنا یا اس میں سستی کرنا ہلاکت اور تباہی کا باعث بنتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہی نجات کا واحد ذریعہ ہے اور آپ ﷺ کی نافرمانی ہلاکت و بربادی کا یقینی راستہ ہے۔ یہ تمثیل ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ جس طرح ایک مخلص خبردار کرنے والا اپنی قوم کو آنے والے دشمن سے بچانے کے لیے پکارتا ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے ہمیں آخرت کے ہولناک عذاب سے ڈرایا ہے۔ یہ ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد اس میں سستی یا شک کرنا انسان کو اس وقت تباہ کر دیتا ہے جب بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہ پیرا گراف ہمیں دعوتِ حق پر فوری لبیک

کہنے اور اپنی زندگی کو نبوی ہدایات کے مطابق محفوظ بنانے کی بھرپور ترغیب دیتا ہے کیونکہ انجام کار کامیابی صرف اطاعت گزاروں ہی کا مقدر ہے۔

عملی رہنمائی:

1. دین کے معاملات میں سستی سے بچنا چاہیے کیونکہ عذاب اچانک آسکتا ہے۔
2. رسول اللہ ﷺ کی ہر بات کو بغیر کسی تردد کے تسلیم کرنا ہی ایمان ہے۔
3. غفلت میں پڑے لوگوں کو حق کی طرف بلانا ہر مومن کی ذمہ داری ہے۔